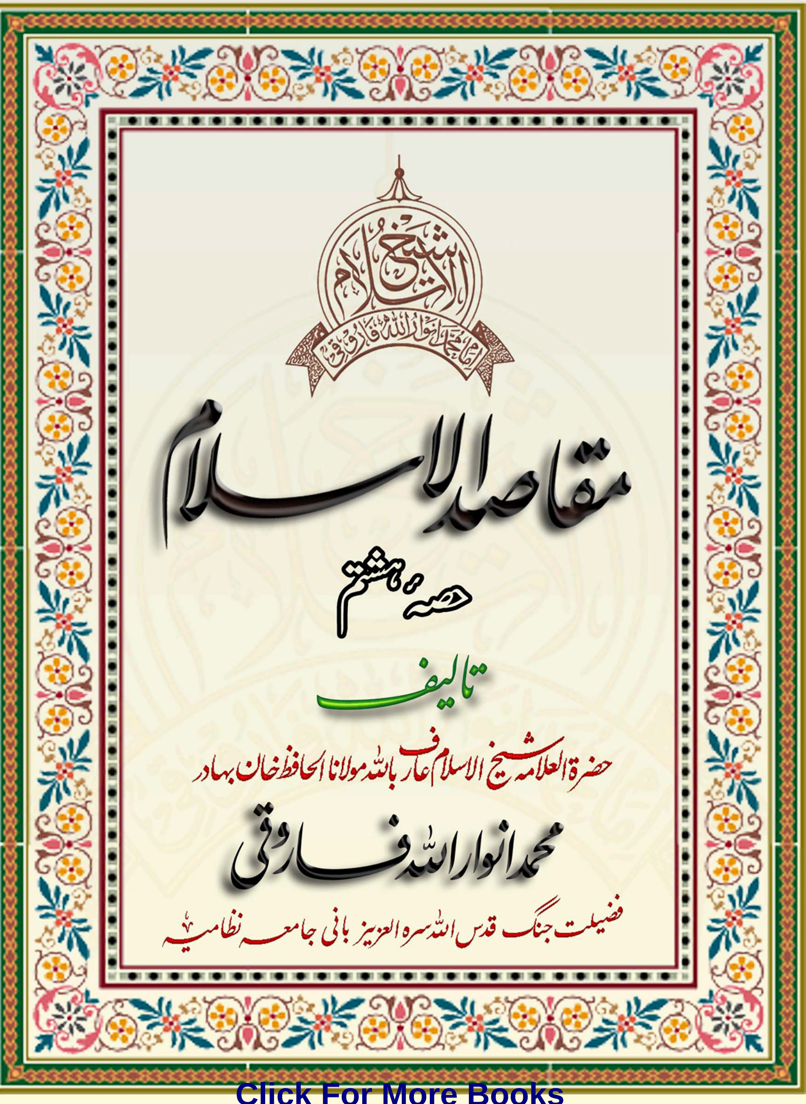

شیخ الاسلام
امام محمد انوار اللہ فاروقی
مقاصد الاسلام
حصہ ہشتم
تالیف
حضرۃ العلامہ شیخ الاسلام عارف باللہ مولانا الحافظ خان بہادر
محمد انوار اللہ فاروقی
فضیلت جنگ قدس اللہ سرہ العزیز بانی جامعہ نظامیہ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ

مقاصد الاسلام

حصہ ہشتم

تفسیر سورہ الناس۔ مسئلہ وحدت الوجود۔ مسئلہ خلق افعال۔ برقی روشنی



حضرۃ العلامہ شیخ الاسلام عارف باللہ مولانا الحافظ خان بہادر محمد انوار اللہ فاروقی

فضیلت جنگ قدس اللہ سرہ العزیز، بانی جامعہ نظامیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَحَبِیْبِہٖ سَیِّدِنا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ،

امابعد: سورۂ ناس سے متعلق چند اشارات ومضامین ہدیہء طلبہ کئے جاتے ہیں اگر غور وفکر سے ان کو دیکھیں تو غالباً اس امر کی صلاحیت پیدا ہوگی کہ تعمق نظر سے مضامین تحریر کرسکیں:

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ اَعُوْذُبِرَبِّ النّاسِ ،مَلِکِ النّاسِ،اِلٰہِ النّاسِ،مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ،اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِالنّاسِ ، مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنّاسِ ،

قُلْ

علمائے صرف نے تصریح کی ہے کہ قل اجوف ہے اور اجوف اسے کہتے ہیں جس کے جوف یعنی بیچ میں حرف علت ہو، یہاں یہ پریشانی ہوتی ہے کہ قل کے دوحرف ہیں پہلا قاف اور دوسرا لام ،اس میں جوف ہی نہیں تو جوف میں حرف علت کیسا ؟ اگر بدؤوں سے کہا جائے کہ قل کے اندر تیسرا حرف بھی ہے اور وہ حرف علت ہے تو باوجو

دیکہ وہ عرب ہیں مگر بادیہ کے رہنے والے ہیں اسکو ہرگز نہ قبول کریں گے، اور یہی کہیں گے کہ ہم اپنے آباواجداد سے قل کے دو ہی حرف سنتے آئے ہیں یہ تیسرا حرف کہاں سے آگیا؟ اگران کے مقابل میں صرفی دلائل قائم کئے جائیں تو وہ سب کا ایک ہی جواب دیں گے **قَدْ وَجَدْنا آبائَنا عَلٰی ھٰذا وَاَنا عَلٰی آثارِھِمْ مُقْتَدُوْنَ** یعنی ہم نے اپنے آباءواجداد کو اسی پر پایا ہے اور ہم ان ہی کی پیروی کریں گے، پھر اگر کچھ زیادہ کہا جائے تو چونکہ بادیہ کے رہنے والے یعنی جنگلی ہیں ضرور لڑائی ہوجائے گی، غرض کہ وہ کبھی نہ مانیں گے کہ قل کے باطن میں بھی کوئی حرف ہے۔

بات یہ ہے کہ سنتے سنتے اور دیکھتے دیکھتے آدمی کی نظر محسوسات پر ایسی جم جاتی ہے کہ باطن پر پڑتی ہی نہیں، اگر آدمی کو موت نہ ہوتی تو کبھی خیال نہ آتا کہ جان بھی کوئی چیز ہے، جب آدمی دیکھتا ہے کہ باتیں کرتے کرتے یکبارگی ایسی حالت اس پر طاری ہوگئی کہ دیکھنا، سننا، چلنا، پھرنا، بات کرنا موقوف ہوگیا اور اس قابل ہوگیا کہ زمین میں چھپادیا جائے تو اس وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ کوئی چیز اس میں ایسی ضرورتھی جس کے نکل جانے سے یہ سب باتیں جاتی رہیں، اور جب تک وہ چیز اس میں تھی یہ کارخانہ انسانیت کا قائم تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ظاہری انسانیت کا مدار ایک باطنی چیز پر تھا، پھر اس باطنی چیز کا نام کسی نے روح رکھا کسی نے جان وغیرہ، ہر قوم کے عقلاء جن کی نظر آثار سے ترقی کر کے مؤثر تک پہونچی انہوں نے اس باطنی چیز تک نظر بڑھا کر کچھ نہ کچھ اس کا نام رکھ ہی لیا ورنہ جو لوگ بہائم سیرت ہیں ان کو تو اس کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ

کسی چیز کے آنے سے آدمی زندہ اور اس کے جانے سے مردہ ہو جاتا ہے، ان کو اس تشخیص کی مصیبت اٹھانے سے کیا تعلق؟ ان کو تو جانوروں کی طرح کھانا پینا مل گیا تو عید ہو گئی اور نہ ملا تو اس کی تلاش کی فکر ہے۔

غرض کہ لفظ ''قل'' کو اجوف کہنا اور اس کے اندر ایک حرف علت کا ماننا سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر جو عقلاء تھے انہوں نے دیکھا کہ ''قل'' کے معنی ''کہہ'' کے ہیں جو امر کا صیغہ ہے اس میں بھی قاف اور لام ہے اور قال یقول قائل وغیرہ میں بھی یہی قاف ولام ہیں مگر ان کے ساتھ کوئی دوسرے حروف بھی ہیں تو ان کی عقل نے گواہی دی کہ ''قل'' میں بھی کوئی حرف ضرور تھا جو کسی وجہ سے حذف ہو گیا، اب انہوں نے غور کیا کہ قال میں (الف) ہے اور قیل میں (ی) اور قول میں (واو) ان میں سے کونسا حرف اس میں ہوگا؟ پہلے اصل کو تلاش کرنے کی ضرورت ہوئی، دیکھا کہ ماضی کے معنی ''کہا'' اور اسم فاعل کے معنی ''کہنے والا'' اور اسی طرح ہر صیغہ کے معنی میں کہنے کے معنی کے ساتھ کوئی اور زیادتی بھی ہے، اس سے معلوم کیا کہ ''کہنا'' جس کے معنی ہیں وہی اصل ہے یعنی قول اسی کو مصدر اور سب کا اصل قرار دیا، اس وجہ سے کہ ایک ایک اعتبار سے اس کے نام بدلتے گئے وہی قول خاص خاص وضع کے لحاظ سے ماضی، مضارع، امر، نہی، اسم فاعل، اسم مفعول، صفت مشبہ، ظرف، اسم تفضیل وغیرہ بنتا گیا، جس سے معلوم ہوا کہ مصدر ایک ایسی چیز ہے جو کہ سب میں وائر وسائر ہے، چونکہ مصدر میں واو تھا اس وجہ سے یقینی طور پر حکم لگا دیا کہ قال میں بظاہر الف ہے مگر دراصل وہ بھی واو تھا، کسی وجہ سے

وہ واواس مقام خاص میں بشکل الف نمایاں ہوا،اور قیل میں اگر چہ (ی) ہے مگر وہ بھی واو ہی تھا جو کسی وجہ سے بشکل (ی) نمایاں ہوا، جاہل جہاں قال میں (الف) اور قیل میں (ی) دیکھتا ہے عالم وہاں قول کا واو خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ظاہراً کچھ بھی ہو مگر باطن میں واو ہے۔

دریافت اصل:

ہر چیز کی اصل دریافت کرنا ایک مشکل کام ہے، جب تک اللہ تعالی کی طرف سے ہدایت نہ ہو کوئی اصل تک نہیں پہونچ سکتا، دیکھئے عالم کی اصل یعنی موجد مقرر کرنے میں کیسے کیسے عقلاء حیران ہیں! کوئی کہتا ہے کہ اصل کچھ بھی نہیں یہ سب یوں ہی بخت واتفاق سے کام چل رہا ہے،کوئی کہتا ہے کہ مادہ اصل ہے جس کے انقلابات سے یہ صورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں، مگر جن کو خدائے تعالی نے ہدایت دی وہ جانتے ہیں کہ یہ سب مخلوق ہیں، جب تک کوئی مستقل وجود نہ ہو جس میں تمام صفات کمالیہ موجود ہوں مثلاً علم قدرت ارادہ وغیرہ کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی۔

مصدر کو آپ جانتے ہیں کہ ظرف ہے یعنی جائے صدور افعال، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مصدر یعنی ''قول'' کے اندر کل مشتقات یعنی قال یقول وغیرہ بھرے ہوئے ہیں ، بلکہ مطلب یہ ہے کہ قول ہی سے ان تمام افعال کا صدور ہوا اور باوجود یکہ قال یقول قائل وغیرہ کے اشکال باہم ممتاز ہیں ان سب کا صدور مصدر سے ہے، جیسے کل

افعال کا صدور روح سے ہوتا ہے اگر روح نہ ہو تو چلنا ہو نہ پھرنا، نہ دیکھنا، نہ سننا، اس سے ظاہر ہے کہ کل افعال کا مصدر روح ہے یعنی جتنے افعال کی شکلیں ہمارے اعضائے ظاہری سے دیکھی جاتی ہیں (مثلاً چلنے کے وقت ہمارے جسم میں ایک ایسی ھیئت پیدا ہوتی ہے جو بیٹھنے کے وقت نہیں ہوتی) ان سب کا مصدر وہی روح ہے، پھر روح بھی آخر ایک مخلوق چیز ہے جب تک اس کا مصدر نہ ہو عالم شہادت میں اس کا ظہور ممکن نہیں، کیونکہ بغیر مصدر کے کسی چیز کا صدور وظہور نہیں ہوسکتا۔

غرضکہ جس طرح عقلاء لفظ قل سے اس کے مصدر تک پہونچ گئے اسی طرح مخلوقات کو دیکھ کر خالق تک پہونچ گئے، اور جس طرح قل کے باطنی واو کو یقینی طور پر مان لیا یہاں تک کہ اگر اس کے وجود پر قسم کھانے کو کہا جائے تو تعجب نہیں کہ عالم قسم کھا کر کہے کہ بے شک حرف علت یعنی واو قل میں ضرور ہے اور قل معتل ہے، اسی طرح عقلمند قسم کھا کر کہے گا کہ خدائے تعالی جس کو ایک اعتبار سے ''علت العلل'' بھی کہہ سکتے ہیں موجود ہے گو نظروں سے غائب ہے۔

حدیث اَنامِنْ نُوْرِ اللهِ :

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ ''قول'' سے قل کس طرح بنا؟ سو پہلے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ زمانہء ماضی بہ نسبت حال واستقبال کے مقدم ہے اور مصدر بھی تمام مشتقات

پر مقدم ہے، اس مناسبت سے لازمی تھا کہ فعل ماضی مصدر سے صادر اول ہو، ہر چند مصدر میں کوئی زمانہ نہیں بلکہ اس کو جو نسبت ماضی کے ساتھ ہے وہی حال استقبال کے ساتھ بھی ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ تقدم کی وجہ سے ماضی کو جو اس کے ساتھ نسبت ہے وہ مضارع کو نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کو جو خاص نسبت خالق عز وجل کے ساتھ ہے دوسرے کو نہیں ہو سکتی، کیونکہ آپ صادر اول ہیں جو اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے اَنَا مِنْ نُورِ اللّٰہِ وَکُلُّ شَیءٍ مِنْ نُوْرِیْ.

الحاصل مصدر سے پہلا صادر فعل ماضی ہے جس میں کچھ زیادتی ہو کر مضارع بنا، غرضکہ قال سے مضارع یقول بنا اور مضارع سے قل امر، اس لئے کہ امر میں بھی وہی زمانہ حال اور استقبال ہے، شاید ہ تدقیق نظر سے یہاں پر یہ خیال کیا جائے کہ جس زمانے میں حکم کیا جاتا ہے اس وقت فعل وجود میں نہیں آ سکتا بلکہ اس کے بعد مخاطب اس کام کو وجود میں لاتا ہے، اس لئے امر میں زمانہ حال نہیں ہو سکتا، سو اس کو یوں دفع کرنا چاہئے کہ یہ خارجی سبب ہے کیونکہ جب تک امر کا صیغہ ختم نہ ہولے مخاطب امتثال نہیں کر سکتا، مگر اس کو وضع میں کوئی دخل نہیں، بسا اوقات متکلم کو یہ منظور ہوتا ہے کہ فوراً وہ کام کیا جائے، اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قصد متکلم کے لحاظ سے وہ زمانہ حال ہی سمجھا جائے گا گویا متکلم اسکو یہ کہہ رہا ہے کہ یہ کام ابھی کر، غرضکہ مضارع اور امر میں مناسبت ہونے کی وجہ سے امر مضارع سے بنایا گیا اس طور پر کہ پہلے علامت مضارع حذف کی گئی کیونکہ اب وہ امر بننے والا ہے۔

ضرورت ترک لوازم بشریت برائے ترقی:

اگر پہلے لوازم وخصوصیات باقی رہیں تو کوئی چیز نہیں بن سکتی، اسی وجہ سے اگر کوئی شخص کمال حاصل کرنا چاہے تو اس کو لازمی ہوگا کہ اپنی سابقہ حالت کے لوازم وآثار کو دور کردے، مثلاً طالب علم اگر عالم بننا چاہے تو جتنے لوازم وآثار جہالت کے ہیں جیسے تضیع اوقات، سستی، کاہلی، خود پسندی وغیرہ جب تک ترک نہ کردے عالم نہیں بن سکتا، جس طرح تقول کا (ت) جو لوازم مضارع سے ہے جب تک دور نہ کیا جائے وہ امر نہیں بن سکتا، اسی پر ہر قسم کے ترقیات کو قیاس کر لیجئے، مثلاً جب تک لوازم ورسوم بشریت فنا نہ ہوں ملکیت میں گزر ممکن نہیں۔

الغرض ''تقول'' کا (ت) امر بنانے کے لئے حذف کیا گیا ہے اب رہ گیا قول، مگر یہ خیال نہ کیا جائے کہ اب وہ مصدر بن گیا اس لئے کہ فرع اپنی اصل نہیں بن سکتی، اور قطع نظر اس کے اس قول کا تو پڑھنا ہی ممکن نہیں کیونکہ ابتداء بسکون محال ہے، اس پر کھلی دلیل یہ ہے کہ جب تک ہم عدم میں تھے ساکن تھے کسی قسم کی حرکت ہم میں نہ تھی، پھر جب حق تعالی کو منظور ہوا کہ ہم وجود میں آئیں تو ''کن'' کا ارشاد ہوا جس سے ہم میں ابتداءاً کسی قسم کی حرکت پیدا ہوئی، پھر پیاپے حرکات شروع ہوگئیں کہ آج ''علقہ'' بنا کل ''مضغہ'' وغیرہ یہاں تک کہ پورے انسان بن گئے، اگر وہ ابتدائی حرکت نہ

ہوتی اور سکون ہی سکون ہوتا تو ہم اس درجہ تک کبھی نہ پہونچ سکتے۔

الغرض ابتداء بسکون ہونے کی وجہ سے صیغۂ امر کا وجود ممکن نہ تھا اس لئے اسکے پہلے ایک متحرک حرف لانے کی ضرورت ہوئی، اور وہ حرف ایسا تجویز کیا گیا کہ عالَم حروف یعنی منہ میں سب سے پہلے اس کا وجود ہو جو حلق کے انتہائی حصے سے نکلتا ہے، جس طرح ابتداء بسکون محال ہونے کی وجہ سے ممکن نہ تھا کہ قول ظہور میں آئے، اسی طرح عالَم جو سکون عدم میں تھا بوجہ سکون ممکن نہ تھا کہ موجود ہو سکے، اس لئے پہلے اسی عالَم میں سے ایک مقدس ذات کو متحرک فرمایا یعنی ہمارے نبی کریم ﷺ کے نور مبارک کو جس کو تمام عالم پر ایسا تقدم ہے جیسے ہمزہ کو عالم حروف پر، اگر ہمزہ قول کے پہلے نہ لایا جاتا تو قول کا عالم حروف میں ظہور محال تھا، اسی طرح اگر حضور ﷺ کا نور مبارک متحرک نہ ہوتا تو عالم کا ظہور محال تھا جیسا کہ حدیث شریف لَوْلاکَ لِمَا خَلَقْتُ الْاَفْلاکَ سے ظاہر ہے، اور جس طرح ہمزہ کی کوئی شکل نہیں جیسا کہ کتب صرف میں مصرح ہے کہ کبھی بشکل واو لکھا جاتا ہے اور کبھی بشکل یا وغیرہ، اسی طرح اس مقدس نور کی کوئی شکل نہیں جیسا کہ اس حدیث سے مستفاد ہے اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰهِ وَكُلَّ شَيْءٍ مِنْ نُوْرِي، غرضکہ اس متحرک ہمزہ نے گویا صیغہء امر کو وجود بخشا جس طرح اس مقدس نور نے عالم امکان کو، بہر حال اب وہ لفظ اُقْوُلُ بنا، مگر چونکہ واو خود دو ضموں سے بنتا ہے اس لئے ضمہ اس پر ثقیل تھا ما قبل کو نقل کر کے دیا گیا اب وہ اقول ہوا، چونکہ متکلم کو حکم کرنے کے وقت نہ جلدی ہوتی ہے کہ مخاطب اس کام کو جلد بجالائے اس جلدی کا یہ

اثر ہے کہ وہ اتنا بھی گوارا نہیں کرتا کہ صیغہ ء امر کے آخر میں حرکت باقی رہے کیونکہ حرکات زبر، زیر، پیش ہیں اور یہ بھی چھوٹے حروف ہیں اس لئے کہ دو زبر کا الف اور دو پیش کا واو اور دو زیر کی یا ہوتی ہے، متکلم کا مقصود اس وقت یہی ہوتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے کلمہ مختصر ہو جائے اور آپ ساکت اور ساکن ہو کر مخاطب کو متحرک کر دے، اسلئے آخر کلمہ کی حرکت کو اور جو حروف کہ حرکت کے امتداد سے پیدا ہوتے ہیں یعنی الف اور واو اور ی کو دور کر کے کلام کو جلد ختم کر دیتا ہے، جب وضع امر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ امر کے وقت متکلم کا یہ مقصود ہوتا ہے کہ امتثال امر میں دیر نہ ہو تو جو عقلاء ہیں امتثال امر میں بہت جلد مصروف ہو جاتے ہیں، خصوصاً ان لوگوں کے امتثال امر میں جن کے حکم کو قابل امتثال سمجھتے ہیں، اسی وجہ سے عملہ میں جو لوگ عقلمند ہوتے ہیں وہ اپنے حاکم بالا دست کا امر ہوتے ہی فوراً اس کی تعمیل کرتے ہیں اور حکام کی نظروں میں بھی ایسے ہی لوگ باوقعت اور قابل ترقی ہوتے ہیں، جب حکام مجازی کے احکام بجالانے کا یہ حال ہو تو احکم الحاکمین کے حکموں کی تعمیل میں کس قدر جلدی کرنی چاہئے! اور جو لوگ ان احکام کو عمدگی اور سرگرمی سے بجالاتے ہیں ان کے مدارج کی ترقی کس درجہ ہوتی ہوگی۔

الحاصل اس ضرورت سے امر کے آخر میں سکون آگیا اب اقول بنا، دو ساکن ایک جگہ جمع ہوئے ایک ساکن حذف کیا گیا کیونکہ دو ساکنوں کے ملنے سے کوئی کام نہیں ہو سکتا، اگر ایک ساکن ہو اور دوسرا متحرک ہو تو متحرک کے طفیل میں ساکن بھی کچھ کر لے گا جس طرح نابینا دیکھنے والے کے طفیل میں منزل مقصود تک پہونچ سکتا ہے، اور اگر

دونوں اندھے اور راستہ سے ناواقف ہوں تو کبھی نہیں پہونچ سکتے، آپ جانتے ہیں کہ عدم میں جتنی چیزیں ہیں خواہ وہ ذوات ہوں یا افعال ان کو کسی قسم کی حرکت نہیں، سب کے سب عدم آباد میں ساکن ہیں جو خدائے تعالی کی پیش نظر ہیں، جب تک ان کو قادر مطلق کن کہہ کر حرکت نہ دے کبھی حرکت ان کو نہیں ہوسکتی، کیونکہ حق تعالی جو خالق عالم ہے اس نے خبر دی ہے کہ جب کسی چیز کو ہم پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو کن کہہ دیتے ہیں اور وہ وجود میں آجاتی ہے کما قال تعالی اِنَّما قَوْلُنا لِشَیْءٍ اِذا اَرَدْناہُ اَنْ نَقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ اس سے ظاہر ہے کہ عدم سے وجود میں لانے کی تحریک قدرت سے ہوتی ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ بندے کی قدرت خود بالذات موجود نہیں اس لئے کہ خود بندہ ہر حال میں خالق کا محتاج ہے جیسا کہ حق تعالی فرماتا ہے اَنْتُمُ الْفُقَرآءُ اِلَی اللّٰهِ تو اس کی حرکت بغیر تحریک خالق کے کیونکر ہو سکے ! غرض بندے کی قدرت بھی ساکن ہے اور معدومات بھی ساکن ، اس لئے عقلاء ایک ساکن کو یعنی بندے کی قدرت کو حذف کر دیتے ہیں کیونکہ التقائے ساکنین سے کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی، اور بندے کو صرف کاسب اور خدائے تعالی کو خالق افعال سمجھتے ہیں، غرض کہ التقائے ساکنین سے واو گر گیا اور ''اُقُل'' ہوا، چونکہ قاف متحرک ہو چکا تھا اس لئے اب ہمزہ کی ضرورت نہ رہی اور وہ حذف کر دیا گیا اور ''قل'' باقی رہ گیا۔

اگر چہ یہ تقریر بظاہر دل لگی سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ صرفی مباحث میں الہیات

واخلاقی مسائل کی جوڑ لگادی گئی ہے، مگر اہل بصیرت جانتے ہیں کہ ہمارے دین میں ایسے امور کی تعلیم دی گئی ہے، چنانچہ اس آیت شریفہ سے مستفاد ہے فَاعْتَبِرُوْا یا اُولِی الْاَبْصَار دیکھئے کل عقلمندوں اور اہل بصیرت کو عبرت حاصل کرنے کا حکم ہو رہا ہے، جن کی نظر اصول لغت پر ہے وہ جانتے ہیں کہ جس لفظ میں (ع ب ر) ہو اس میں عبور اور تجاوز کے معنی ضرور ہوں گے دیکھئے ''معبر'' رہگزر کو کہتے ہیں جہاں آدمی ٹھہر نہیں سکتا اور عبور کے معنی اس پار اتر جانے کے ہیں، اسی طرح عرب کا نام بھی ''عرب'' اس وجہ سے رکھا گیا کہ وہ ایک جگہ مقیم نہیں رہتے تھے اسی طرح کل تقالیب میں تجاوز کے معنی ہیں ،اب اعتبار کی حقیقت پر غور کیجئے کہ وہ کیا چیز ہے اور اس کا طریقہ کیا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ قرآن شریف میں قارون، فرعون، ہامان، شداد، نمرود، بنی اسرائیل وغیرہ اشخاص واقوام کے بہت سے قصے مذکور ہیں اور یہ بھی ہر عاقل جانتا ہے کہ خدائے تعالی کی شان نہیں کہ گزشتہ لوگوں کے قصے کہانیاں بیان کرے، بلکہ کلام الٰہی کی شان یہ ہے کہ جو بات ہو اس میں بندوں کی ہدایت اور بہبودیٔ دارین رکھی ہو، اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ جتنے قصے قرآن شریف میں مذکور ہیں سب سے مقصود یہی ہے کہ اس قسم کے کام اگر ہم بھی کریں تو ہمارا انجام بھی وہی ہوگا جو ان کا ہوا ہے، اس سمجھ کا نام ''عبرت'' ہے۔

پس اس سے یہی ثابت ہوا کہ جو واقعہ سنا جائے اس سے عبور کر کے دوسری طرف نظر ڈالی جائے اور ایک نیا مضمون پیدا کیا جائے، مثلاً قارون کے قصے سے یہ عبرت ہونی چاہیئے کہ جو شخص مال کے ساتھ اتنی محبت رکھے اور دین کے کاموں میں اس

کوصرف نہ کرے تو اس کا انجام ہلاکت اور عذاب ہے، غالباً ایسے لوگ بھی ہوں گے کہ تمام قرآن کے قصے پڑھتے اور بار بار واعظوں سے سنتے اور کتابوں میں دیکھتے ہوں گے مگر حاتم طائی وغیرہ کے فرضی قصوں سے زیادہ دلچسپی اس میں ان کو نہیں ہوتی ہوگی ،مطلب یہ ہے کہ قرآن کے قصے اور فرضی قصے صرف دلچسپی کے لحاظ سے سنے جاتے ہیں ،مثلاً اگر قارون کا قصہ بطور عبرت سنا جائے تو ممکن نہیں کہ اہل ایمان کو مال کے ساتھ ایسا تعلق رہے کہ بطور دینی امور میں نہ صرف کریں، اسی طرح فرعون وغیرہ کے قصوں سے اگر عبرت حاصل کی جائے تو آدمی متقی ہو جائے، مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

آنچہ در فرعون بود آں در تو ہست

ایک اژ درہات محبوس تو سہت

اے دریغ آں جملہ احوال تو ہست

تو براں فرعون بر خواہش بست

آنچہ گفتم جملگی احوال تست

خود نہ گفتم صد یکے زانہا درست

گرز تو گوئندہ وحشت زایدت

دز زدیگرآں فسانہ آیدت

حاصل یہ کہ صفات فرعون وغیرہ آدمی میں موجود ہیں آدمی کو چاہیئے کہ ان سے

پرہیز کرے ورنہ انہیں سزاؤں کا مستحق ہوگا جو ان لوگوں کو دی گئی تھیں۔

ایک بزرگ راستہ سے جارہے تھے سنا کہ ککڑی بیچنے والا کہہ رہا ہے **الخیار بعشرۃ** یعنی ککڑی کھیرا دس پیسہ کو! یہ سنتے ہی ان کی حالت متغیر ہوئی اور یہاں تک نوبت پہونچی کہ بیہوش ہوکر گر پڑے کچھ دیر کے بعد جب ہوش آیا اور لوگوں کو دیکھا کہ بیہوشی کی وجہ تلاش کررہے ہیں فرمایا کہ جب اس شخص سے میں نے سنا کہ بآواز بلند برسر بازار کہہ رہا ہے کہ خیار دس پیسہ کو تو میرے خیال میں بات جمی کہ ''خیار'' یعنی اچھے لوگوں کی جب یہ حالت ہو تو ''شرار'' کو کون پوچھے! اپنے اعمال کا نقشہ میرے پیش نظر ہوگیا جس سے میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور بے ہوشی طاری ہوگئی، دیکھئے **الخیار بعشرۃ** سے وہ حضرت عبور کرکے کہاں پہونچ گئے! حالانکہ دونوں میں سوائے لفظی مناسبت کے کوئی معنوی مناسبت نہیں، سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

نہ گویند از سر بازیچہ حرفے

کزاں پندے نہ گیرد صاحب ہوش

لطائف اشرفی میں لکھا ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ نے ایک روز ناقوس کی آواز سنی فرمایا: یہ کہتا ہے سُبحانَ اللّٰہِ حَقّاً حَقًّا اِنَّ الْمَوْلیٰ یَبْقٰی.

یہ بات تو معلوم ہوئی کہ قول مصدر ہے اسی سے تمام صیغے بنتے ہیں، مگر یہ نہیں معلوم ہوا کہ سبب کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ مصدر کے ساتھ ایک خاص نسبت متعلق ہوجاتی ہے جس سے خاص معنی پیدا ہوتے ہیں جو نام کے بدلنے کے باعث ہوتے ہیں

مثلاً قول کے معنی (کہنا) ہیں اس کے ساتھ یہ نسبت لگی کہ کہنا زمانہ گزشتہ میں واقع ہوا ،اس کا نام ماضی ہوا اور اس کے لئے صورت بھی ایک خاص قسم کی پیدا ہوئی یعنی قال ،غرضکہ قال وہی قول ہے جس کے ساتھ نسبتِ مذکورہ ہے ،اور اسی قول میں جب یہ نسبت ملحوظ ہوئی کہ حال واستقبال میں اس کا وقوع ہے تو اس کا نام مضارع ہوا اور صورت یقول بنی ،جس کا مطلب یہ ہوا کہ یقول صرف قول ہے مگر نسبتِ مذکورہ کے لحاظ سے ،علیٰ ہذاالقیاس قائل میں بھی وہی قول ہے،جس کے ساتھ یہ نسبت ملحوظ ہے کہ قول کو کسی شخص کے ساتھ خاص قسم کی نسبت ہے کہ قول اس میں پایا جارہا ہے جس سے معنی من لہ القول کے صادق آتے ہیں، بہر حال جتنے مشتقات ہیں سب میں وہی قول دائر اور سائر ہے گو صورتیں جدا جدا ہیں ،اب اگر کہئے کہ قول کا ظہور قال یقول وغیرہ میں ہوا اور وہ مصدر کے مظاہر ہیں تو بے موقع نہ ہوگا کہ آخر مصدر ہی میں وہ تمام نسبتیں ملحوظ ہیں جو یہ تمام صورتیں پیدا کررہی ہیں ،اب اگر ان نسبتوں کو دیکھئے تو نہ قول کی ذات میں داخل ہیں نہ مشتقات کی ذاتوں میں ،کیونکہ نسبت غیر مستقل چیز ہے جو منتسبین کے درمیان ہوتی ہے،حالانکہ مشتقات مستقل صیغے ہیں مگر ہوا یہ کہ نسبت غیر مستقلہ نے ان کی مستقل صورتیں بنادیں۔

اسی قسم کی تقریر کلیات میں بھی ہوسکتی ہے،مثلاً حیوان فی حد ذاتہ ایک ہے اس میں کسی قسم کی کثرت نہیں ،کیونکہ معنی سے صاف ظاہر ہے کہ جب اس کا اطلاق ہوگا ایک ہی شخص پر ہوگا،اگر دو پر اطلاق ہو تو ''حیوانان'' اور کثیر پر ہو تو ''حیوانات'' کہیں گے

،اب یہ دیکھنا چاہئے کہ حیوان کے ساتھ جوفصول لگتے ہیں وہ اس کے اوصاف ہیں یا کوئی مستقل چیزیں ہیں؟ یہ ہرگز سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مستقل چیزیں ہیں، بلکہ ظاہر ہے کہ نطق مثلاً ایک صفت ہے جس طرح علم وغیرہ ،اسی طرح ہندی رومی وغیرہ بھی صفات ہیں ،غرضکہ کوئی صفت داخل نفس شئے نہیں ہوسکتی ، جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ نطق وسمع وعلم وغیرہ صفات ہیں تو کیا وجہ کہ نطق تو انسان کی ذات میں داخل ہواور علم وغیرہ اس سے خارج رہیں۔

بہر حال حیوان ایک چیز ہے اس کے ساتھ کبھی نطق کا لحاظ ہوتا ہے کبھی دوسری صفات کا ،اور جس صفت کا لحاظ ہوگا ایک نام اس پر آجائے گا ،مثلاً نطق کا لحاظ ہوگا تو اس کو آدمی کہیں گے ،اور اس صفت کا مدار ایک نسبت پر ہوگا ،مثلاً علم ایک خاص نسبت ہے جو عالم ومعلوم کے درمیان ہے جس کی وجہ سے ایک کو عالم اور دوسرے کو معلوم کہتے ہیں ،اسی طرح حیوان اور نطق میں ایک خاص نسبت ہے جس کی وجہ سے اس کو ناطق کہتے ہیں ،آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے سے جانور ،لکڑی ، پتھر بات کرتے تھے یہی نسبت ان میں پائی گئی اس لئے ان پر بھی ناطق کا اطلاق ہوا ،اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گونطق صفت ہے مگر اسی وقت تک کہ آدمی بات کرتا رہے اور جب بات کرنا موقوف کر کے کسی کی بات سننے لگا تو اس کو سامع کہیں گے ،علی ہذاالقیاس دوسری صفات ،اب وقت واحد میں صرف اس لحاظ سے کہ کسی وقت اس نے بات کی تھی یا سنی تھی اس کو ناطق اور سامع کہنا مجازاً ہوگا حقیقۃً ناطق اسی وقت سمجھا جائے گا جب تک کہ بات کررہا ہو۔

کلام اس میں تھا کہ قول واحد شخصی ہے جو قال یقول قائل وغیرہ میں ظہور کر رہا ہے، مگر یہ خیال نہ کیا جائے کہ جس طرح پانی کوزے وغیرہ میں ہوتا ہے اسی طرح قول ماضی وغیرہ میں ہے، اس لئے کہ کوزہ مستقل چیز ہے اور پانی بھی مستقل ہے، ایسی صورت کو حلول کہتے ہیں، اور یہاں یہ بات نہیں ہے، اس لئے کہ قول کی ان صورتوں میں فقط ھیئت بدل رہی ہے، جیسا کہ ضحک کی وجہ سے انسان کی ھیئت بدل جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کو ضاحک کہتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ انسان ضاحک میں حلول کر گیا ہے۔

جب یہ معلوم ہوا کہ قول بذاتہ موجود اور بلاتغیر وتبدل سب میں دائر وسائر ہے کیونکہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ قول کا ظہور جب تک قال میں ہے یقول میں نہیں، بلکہ یقیناً کہا جاتا ہے کہ ہر وقت پورے قول کا ظہور قال یقول وغیرہ کل مشتقات میں یکساں ہے تو اس موقع پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ الکل فی الکل یعنی کل قول سب مشتقات میں ہے البتہ ہر ایک مظہر کی خصوصیات جداگانہ ہے، مثلاً قائل سب زمانوں سے آزاد ہے، مگر ایسی ذات کا محتاج ہے جس میں قول پایا جائے، اور قال یقول زمانوں کے ساتھ مقید ہیں، علی ھذا القیاس کل مشتقات کسی نہ کسی چیز کے محتاج ہیں، اور قول باوجود ان سب میں دائر وسائر ہونے کے کل احتیاجوں سے بری ہے، اور باجودیکہ کل مشتقات میں نازل ہے مگر کسی کا محتاج نہیں، بخلاف ان مشتقات کے کہ وہ ہر وقت اس کے محتاج ہیں، کیونکہ جب تک قول کا وجود ان میں نہ ہو کسی کا وجود نہیں ہوسکتا۔

اعوذ

اَعُوْ ذُ یعنی پناہ مانگتاہوں میں ، پناہ جوکسی سے چاہی جاتی ہے اسکا منشایہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی مضر چیزاس کے پیش نظر ہوجاتی ہے جس کی مقاومت نہیں کرسکتا، اور اپنے میں یہ قوت نہیں پاتا کہ اس کا مقابلہ کرسکے، اس لئے کسی ایسے شخص کو تلاش کرتا ہے جواس کا مقابلہ کرکے اس کے شراور آفت سے بچاسکے، جس چیز سے خوف ہوتا ہے اس کو معوَّذ منہ کہتے ہیں اور بچانے والے کو معوَّذ بِہ، اس آیت شریفہ میں مُعوَّذُ مِنہُ شیطان کا شر ہے اور مُعوَّذُ بہ اللہ تعالی۔

اللہ تعالی نے اس سورہ میں تعلیم دی ہے کہ شیطان کے شر سے ہمارے پاس پناہ لو، کیونکہ ہم پرورش کرنے والے بھی ہیں اور بادشاہ بھی ہیں اور معبود بھی، ان صفات کے بیان فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی وسوسہ اندازی کے مواقع یہی اوصاف ہیں، پہلے ربوبیت الہی سے متعلق وسوسے ڈالتا ہے اور حتی الامکان یہ کوشش کرتا ہے کہ خدائے تعالی کی ربوبیت ذہن نشین نہ ہونے پائے، کیونکہ آدمی بلکہ جانور کی بھی طبیعت کا یہ مقتضا ہے کہ اپنی پرورش کرنے والے کے ساتھ دل سے محبت رکھتا ہے اور اس کی ربوبیت کو مانتا ہے اور اس کی کسی بات کو نہیں ٹالتا، دیکھ لیجئے جولوگ ہزار بارہ سو روپیہ ماہوار پاتے ہیں وہ اپنے سردار کی بات پر جان تک دے دیتے ہیں۔

شیطان کو بڑی فکر اس امر کی لگی رہتی ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خدائے

تعالی اصلی رب اور پرورش کرنے والا ہے تو اس سے کمال درجہ کی محبت ہو جائے گی اور جو کچھ اس کے ارشادات ہیں سب مان لئے جائیں گے خصوصاً پنج وقتہ نماز، روزے اور حج وزکاۃ وغیرہ ضروریات دین کے لوگ پابند ہو جائیں گے اور جتنی بری باتیں ہیں سب چھوڑ دیں گے جس سے فضل الٰہی کے مستحق ہو جائیں گے، اور اس کا مقصود جو اولاد آدمؑ کو تباہ کرنا ہے فوت ہو جائے گا، اس لئے عموماً مسلمانوں کے خیال کو بھی حق تعالی کی طرف رجوع ہونے نہیں دیتا، بلکہ جب کوئی حاجت اور ضرورت پیش ہوتی ہے اس وقت یہ سمجھاتا ہے کہ فلاں کے پاس چلو اور فلاں سے مدد لو اور فلاں قسم کا کام کرو، غرض کہ ایک ایسا سلسلہ قائم کر دیتا ہے کہ نوبت ہی نہیں آتی کہ اللہ تعالی کی ربوبیت پیش نظر ہو، اور یہ سلسلہ اس کے خیال کو کچھ ایسا پابند بناتا ہے کہ گویا پابہ زنجیر ہو کر آدمی اسی قید خانہ میں پڑا رہتا ہے، اور اگر ربوبیت کا کبھی خیال آ بھی گیا تو وہ ایسا ہوتا ہے جیسے بے ضرورت بہت سارے خیال ہمیشہ آتے رہتے ہیں اور ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا، ایسے لوگوں کی ہدایت کے لئے ارشاد ہوا کہ: جب لوگوں کی ربوبیت تمہارے پیش نظر ہو جائے اور شیطان کا افسوس تم پر اثر کر جائے تو رب الناس کی پناہ میں آ جاؤ اور یہ سمجھ لو کہ اصل ربوبیت مقیدہ اللہ تعالی ہی کی ربوبیت ہے، جب ربوبیت مطلقہ کے میدان میں قدم بڑھاؤ گے تو تمہیں شیطان کے شر سے جس نے تمہیں قیدی بنا رکھا ہے پناہ مل جائے گی، مگر مشکل یہ ہے کہ پناہ لینے کی ضرورت ہی ہر شخص کو محسوس نہیں ہوتی۔

شیطان کی دشمنی:

کیونکہ لڑکپن سے عادت ہوگئی ہے کہ اسباب ہی پر آدمی کی نظر پڑتی ہے،ضرورت تو ان لوگوں کومحسوس ہوتی ہے جو خدائے تعالی کے کلام پر صدق دل سے ایمان لاتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ شیطان ہمارا جانی دشمن ہے،اس کی عداوت کا حال خدائے تعالی نے اپنے سچے کلام میں جا بجا بیان فرمایا،کہیں ارشاد ہے اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْن یعنی یقیناً شیطان تمہارے لئے کھلا دشمن ہے،اورکہیں ارشاد ہے کہ شیطان آدمی کو کافر بنا کر کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں اور خدا سے ڈرتا ہوں کماقال تعالی کَمَثَلِ الشَّیْطَانِ اِذْقَالَ لِلْاِنْسَانِ اکْفُرْ فَلَمَّا کَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْءٌمِنْکَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْن .

الحاصل جب آدمی خدا اور رسول کے ارشادات سے بے پروائی کر کے جس طرح عمل کرنے کا حق ہے نہ کرے اور اپنی خواہش کے مطابق باغوائے شیطانی سارے کام کیا کرے تو شیطان کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور گناہ کراتے کراتے کفر تک نوبت پہونچا دیتا ہے،کیونکہ خواہشات نفسانی کے مقابلہ میں کلام الٰہی کی وقعت ہی نہ ہو تو پھر کون سی چیز ہوگی جو کفر سے اس کو بچا سکے؟ممکن ہے کہ مثل اور خواہشوں کے اسکا بھی مرتکب ہو جائے،بخلاف اس کے کہ ہر بات میں جب خدا اور رسول ﷺ کے کلام پر عمل

کرنے کا خیال ہو تو کفر سے بہت کچھ احتیاط کرسکتا ہے، اور اگر معاذ اللہ شیطان کو کافر بنانے کا موقع مل گیا تو اس نے بازی جیت لی اور بارگاہ الٰہی سے مطرود و مردود کر کے ابد الآباد کے لئے اس کو دوزخ کا مستحق بنادیا، حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ شیطان آدمی سے کبھی بے فکر ولا پرواہ نہیں ہوسکتا جب تک اس کو کافر نہ بنالے۔

پناہ میں آنے کا طریقہ:

اب غور کیجئے کہ شیطان آدمی کا کیسا دشمن ہے اور کس طرح تاک میں لگا ہوا ہے؟ ایسے دشمن سے بچنے کی کس قدر ضرورت ہے، جب ہمیں معلوم ہے کہ اس کا تسلط دل پر ہے جس طرح چاہتا ہے برے خیالات دل میں پیدا کرتا ہے، اگر دور ہی سے کچھ کہہ دیتا تو ممکن تھا کہ اس کی بات کی طرف توجہ نہ کرتے، مگر وہ ہمارے دل میں تک گھس جاتا ہے اور وہاں جا کر ایسی باتیں ہمارے دل میں ڈالتا ہے کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس نے کہا یا ہمارے دل نے؟ غرضکہ اس سے بچنا ہمارے اختیار سے باہر معلوم ہوتا ہے، اس لئے جب تک ہم خدائے تعالی کی پناہ میں نہ ہوجائیں ممکن نہیں کہ اس کے دام سے ہمیں رہائی ہو، اسی وجہ سے تعلیم فرمائی گئی کہ شیطان کے مکروں سے اگر بچنا ہو تو ہماری پناہ میں آجاؤ، پھر جو شخص خدا کی پناہ میں آجائے تو ممکن نہیں کہ شیطان تو کیا تمام عالم اس کو ضرر پہونچا سکے۔

مگر یہ یاد رہے کہ پناہ میں آجانا بھی آسان نہیں، صرف کہہ دینا اس کے لئے کافی نہیں ہوسکتا، دیکھئے آدمی کسی کی پناہ میں اسی وقت آتا ہے کہ جب اس کو یقین ہو کہ موذی ضرر رساں کے مقابلہ کی طاقت اپنے میں نہیں ہے، پھر جس کی پناہ میں وہ جاتا ہے اس کی نسبت یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کے ضرر سے ضرور بچائے گا، اور اس کے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے جس کی پناہ میں جاتا ہے اس کو لازم پکڑتا ہے اور اس سے علحدہ نہیں ہوتا، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس سے علحدہ ہوجاؤں گا تو ضرور دشمن غالب ہوجائے گا، یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہتے، خود ''عوذ'' کے لفظ سے نکلتی ہے کیونکہ عوذ کے معنی میں چمٹنا داخل ہے، جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہے **اطیب اللحم عوذہ** یعنی عمدہ گوشت وہ ہے جو ہڈی کو لگا ہوا ہو، چونکہ عوذ اور تعوذ کا مادہ ایک ہی ہے اس سے ظاہر ہے کہ تعوذ میں بھی معنی چمٹنے اور لازم پکڑنے کے ہوں گے۔

اونٹ آنحضرتؐ کی پناہ میں آیا:

امام منذرؒ نے ترغیب وترہیب میں ابن ماجہ سے نقل کیا ہے کہ تمیم داریؓ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک اونٹ دوڑتا ہوا آکر حضرت ﷺ کے پاس کھڑا ہوگیا، حضرت ﷺ نے فرمایا اے اونٹ بے فکر رہ! اگر تو سچا ہے تو تیرا صدق تیرے کام آئے گا، اور جھوٹا ہے تو اس کا وبال تجھ پر ہے، اور فرمایا مع ان

اللہ قدامن عائذنا ولیس بخائب لائذنا یعنی اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جو ہم سے پناہ لیتا ہے اللہ تعالی اسے امن وامان دیتا ہے اور ہم کو پشت پناہ بنانے والا بے نصیب نہیں ہوتا، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اونٹ کیا کہتا ہے؟ فرمایا اس کے مالک اس کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھانا چاہتے ہیں اسی لئے اس نے بھاگ کر تمہارے نبی کی پناہ لی، یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ لوگ دوڑتے ہوئے آپہونچے، جب اونٹ نے انہیں دیکھا آنحضرت ﷺ کے سرِ مبارک کے قریب ہوکر پناہ میں آگیا، اور ان لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! یہ ہمارا اونٹ ہے تین روز سے بھاگا ہوا ہے جو اس وقت آپؐ کے روبرو ملا، حضرت ﷺ نے فرمایا وہ تمہاری شکایت کرتا ہے، انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا شکایت ہے؟ فرمایا یہ کہتا ہے کہ کئی سال تمہارے دامن میں وہ پرورش پایا، موسم گرما میں تم اس پر سامان لادکر ان علاقوں میں جاتے تھے جہاں گھاس ہوتی ہے، اور موسم سرما میں گرم مقامات میں جاتے تھے، جب وہ بڑھاپے کے قریب پہونچا تو تم نے اس سے اولاد لی اور بہت سے اونٹ تمہارے پاس ہوگئے، اور جب تروتازہ اور سرسبز سال آیا تو تم نے قصد کیا کہ اس کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھالیں، انہوں نے عرض کی کہ یہ سب درست ہے یارسول اللہ حضرت ﷺ نے فرمایا یہ مملوک صالح کی جزا نہیں ہوسکتی، انہوں نے عرض کی اب ہم اس کو نہ بیچیں گے نہ ذبح کریں گے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا تم جھوٹ کہتے ہو، اس نے تم سے فریاد کی اور تم نے اس کی فریادرسی نہیں کی، مجھے اس پر رحم کرنے کا استحقاق تم سے زیادہ ہے، خدائے تعالی نے

رحمت کو منافقوں کے دلوں سے نکال دیا اور مسلمانوں کے دلوں میں اس کو جگہ دی ہے ، پھر آنحضرت ﷺ نے ان کو سو (۱۰۰) درہم دے کر وہ اونٹ ان سے خرید لیا، اور اس سے فرمایا: اے اونٹ چلا جا تجھے اللہ کے واسطے ہم نے آزاد کر دیا، دیکھئے پناہ لینے کا یہ طریقہ ہے، جب اونٹ نے دیکھا کہ جان کی خیر نہیں اور بغیر کسی زبردست پناہ کے مالکوں کے ہاتھ سے نجات نہیں مل سکتی تو ایسی زبردست پناہ میں آ گیا جو دونوں عالم کا پشت پناہ ہے، اور چونکہ صدق دل سے اس نے پناہ لی تھی تو آنحضرت ﷺ نے بھی اسے اپنی پناہ میں لے کر نجات دلوادی۔

شیطان کے مکاید بیان کرنے کی ضرورت:

حاصل یہ ہے کہ شیطان جب تک ایسا دشمن نہ مانا جائے کہ ہم اس کے مقابلہ سے عاجز ہیں خدائے تعالی کی پناہ میں جانے کی ضرورت نہ سمجھی جائے گی ، ہمارے زمانے کے بعض واعظین حضرات پہلے تو شیطان کا نام ہی نہیں لیتے اگر لیتے ہیں تو ایسے مواقع کے ضمن میں کہ شیطان کے وہاں پر جلتے تھے، مثلاً بزرگان دین کی حکایات کے ضمن میں کہ شیطان کو انہوں نے ذلیل وخوار کر دیا تھا، اور ایسی حکایات اور واقعات بیان کئے جاتے ہیں کہ شیطان بالکل بے وقعت ہو جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سننے والے بالکل بے خوف ہو جاتے ہیں، اور قرآن شریف میں جس قدر اس سے ڈرایا

گیا ہے بے سود ہوتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ رحمت الٰہی بہت وسیع ہے اور شفاعتِ نبی کریم ﷺ بھی گنہگاران امت کے لئے ضرور ہوگی، مگر یہ کیونکر یقین ہو کہ پہلے ہی شفاعت میں ہم ضرور شریک ہوں گے، یہ اشتباہ ہوگیا تو ہر ایمان والے کو یہ فکر لگی رہنی چاہئے کہ معلوم نہیں کہ ہم کس زمرہ میں ہوں گے؟ اور حتی المقدور ظلم اور مخالفت خدا اور رسول سے بچنا عقلاً لازمی ہوگا، کیونکہ سوائے انبیاء علیھم السلام کے کوئی معصوم نہیں، اور حقوق اللہ سے زیادہ ان کو حقوق الناس کا خوف رہتا ہے کہ کہیں ہم پر کسی آدمی کا حق باقی نہ رہ جائے جس کا مواخذہ قیامت میں ہو، کیونکہ قیامت میں جب حساب و کتاب ہوگا تو حقدار کا حق اس طرح دلایا جائے گا کہ جس پر اس کا حق ہو اس کی نیکیاں حقدار کو دلائی جائیں گی اور اگر نیکیاں کافی نہ ہوں تو حقدار کے گناہ اس کے اعمال میں بھرتی کئے جائیں گے، جس سے اس کی سبکدوشی ہو، اگر کتب احادیث دیکھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ ایک ایک گناہ سے متعلق کیسے کیسے عذاب بیان فرمائے ہیں۔

وعید کی پرواہ نہ کرنے کی قباحت:

اب غور کیا جائے کہ جب آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ برے کاموں سے منع اور ان کے مرتکبوں کے لئے خاص خاص قسم کے عذاب بیان فرمائے تو کیا نعوذ باللہ حضرت ﷺ کا یہ فعل عبث ہوسکتا ہے؟ اگر فرض کیا جائے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی مجلس میں لوگوں

سے فرمایا ہو کہ فلاں کام کرنے والے کو اس قسم کا عذاب ہوگا اور کوئی شخص ان لوگوں سے کہتا کہ مسلمانوں کو کچھ عذاب نہ ہوگا یہ صرف دھمکی اور ڈرانے کے لئے فرماتے ہیں ،اوراس کی اطلاع حضرتﷺ کو ہو جاتی تو کیا حضرتﷺ اس شخص سے راضی رہتے؟ عقل تو ہر گز قبول نہیں کرتی کہ جس کام کو حضرتﷺ بہ نفس نفیس اہتمام فرمائیں اور کوئی شخص اس کے خلاف میں گفتگو کرے وہ خلاف مرضی نہ ہو، جب ہم جانتے ہیں کہ اب بھی آنحضرتﷺ کو اپنے امتیوں کے کاموں کی اطلاع ہوتی ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس قسم کی گفتگو کہ گناہ کرنے سے مسلمانوں کو کچھ ضرر نہ ہوگا آنحضرتﷺ کے خلاف مرضی ضرور ہوتی ہے ،اور علاوہ اس کے اسکا برا اثر تمدن پر پڑتا ہے کہ مسلمان جو جی چاہے کریں ان کو سب معاف ہے ،حالانکہ آنحضرتﷺ اسی غرض سے مبعوث ہوئے تھے کہ دنیا میں امن وامان قائم کر کے اس کو مزرعۃ الآخرہ بنائیں ،اور امن وامان بغیر اصلاح تمدن کے ممکن نہیں۔

چند احادیث بطور ''مشتے نمونہ از خروارے'' نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ خدا اور رسول کو عبادات اور اصلاح تمدن میں کس قدر اہتمام ہے:

ترغیب وترہیب میں امام منذر نے کتب صحاح وغیرہ سے مندرجہ ذیل روایات نقل کی ہیں کہ نبیﷺ نے فرمایا کہ ''شرک وکفر میں فقط نماز کا فرق ہے'' یعنی اگر نماز ترک کردی جائے تو آدمی مشرک اور کافر ہو جاتا ہے، بلکہ یہ بھی صاف فرمادیا کہ جو شخص قصداً نماز ترک کرے وہ کافر ہو گیا۔

اور فرمایا کہ: چار چیزوں کو خدائے تعالی نے اسلام میں فرض کیا ہے، رمضان کے روزے، حج، زکاۃ، نماز، اگر کوئی شخص ان میں سے تین کو بھی ادا کرے کچھ فائدہ نہیں جب تک کہ چاروں کو بجانہ لائے۔

اور فرمایا جو شخص نماز کی محافظت نہ کرے یعنی ہر نماز کو وقت پر ادا نہ کرے وہ قیامت کے روز قارون، فرعون، ہامان اور ابی ابن خلف کے ساتھ ہوگا، یعنی بجائے اس کے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمرہ میں اس کا حشر ہو کفار کے ساتھ اس کا حشر ہوگا۔

اور فرمایا کہ جس شخص کے پاس سونا ور چاندی ہو اور وہ اس کی زکوۃ نہ دے تو قیامت کے روز اس کی تختیاں بنائی جائیں گی اور ان کو دوزخ کی آگ میں گرم کر کے ان سے اس کی پیشانی اور بازو اور پیٹھ کو داغ دئے جائیں گے، جب وہ ٹھنڈے ہونے لگیں تو پھر گرم کرتے جائیں گے، یہ عذاب دن بھر ہوتا رہے گا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہے، اس کے بعد دوزخی ہو تو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا اور جنتی ہو تو جنت میں داخل کیا جائے گا۔

اور فرمایا کہ: جو گوشت اور خون مال حرام کے کھانے سے پیدا ہو وہ جنت میں نہ جائے گا بلکہ نار جہنم کا وہ مستحق ہے۔

اور فرماما کہ: جو شخص قسم کھا کر کچھ مال حاصل کرے یا کسی کا حق تلف کرے تو دوزخ اس کے لئے واجب ہوگی۔

اور فرمایا: چار قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کو اللہ تعالی جنت میں نہ داخل کرے گا

اور نہ اس کی کوئی نعمت ان کو چکھائے گا! شرابی، ربا یعنی سود کھانے والا اور ماں باپ کا نافرمان، اور فرمایا کسی مسلمان کی بے عزتی کرنی ربا سے بڑھ کر گناہ ہے، اور فرمایا جس حاکم کا جور اور بے انصافی اس کے عدل پر غالب ہو اس کا مقام دوزخ ہے۔

اور فرمایا کہ: جو کوئی کام مسلمانوں سے متعلق تفویض کیا جائے اور وہ ان میں عدل اور انصاف نہ کرے حق تعالی اس کو دوزخ میں اوندھا ڈالے گا۔ اور فرمایا کہ: رشوت دینے والا اور لینے والا اور جو رشوت پہونچانے میں واسطہ ہو ان سب پر خدا کی لعنت ہے، یعنی آخرت میں رحمت الٰہی سے دور ہیں۔

اور فرمایا کہ: تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کی: ہم تو اسی کو مفلس سمجھتے ہیں جس کے پاس روپیہ اور متاع نہ ہو، فرمایا! میری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت میں ایسی حالت میں اٹھے کہ اس کے اعمال میں نماز، روزہ اور زکاۃ سب کچھ موجود ہیں مگر اس کی حالت دنیا میں یہ تھی کہ کسی کو گالی دی، کسی کا مال کھا گیا، کسی کو مارا، کسی کا خون بہایا، وہاں سب اہل حقوق آئیں گے اور ہر ایک کو اس کی نیکیاں دی جائیں گی اور کل حقوق کی ادائی سے پہلے اگر اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو اہل حقوق کے گناہ اس پر ڈالے جائیں گے یہاں تک کہ وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا، مطلب یہ کہ کوئی نیک کام اس کے کام نہ آئے گا۔

اور فرمایا: جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اس کی مدد کی غرض سے چلے اور وہ جانتا ہو کہ وہ ظالم ہے یعنی حق پر نہیں ہے تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔

اورفرمایا: بادشاہ کوایسی بات سے راضی کرے جس میں خدائے تعالی کی ناخوشی ہووہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔

اورفرمایا: جو شخص مسلمان کے ضرر پر ایسی گواہی دے جو اس کے لائق نہیں تو چاہیئے کہ وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے، مطلب یہ کہ کوئی الزام ناحق مسلمان کے ذمہ لگانے والا گویا اپنے اختیار سے دوزخ میں جگہ لے لیتا ہے۔

اورفرمایا کہ: جھوٹی گواہی دینے والا میدان حشر میں قبل اس کے کہ اپنے مقام سے ہٹے حق تعالی اس کے لئے دوزخ واجب کردے گا اور وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

اورفرمایا کہ: جو شخص کسی مقدمہ کو جانتا ہے اور گواہی کے لئے بلانے پر واقعہ کو چھپادے اور گواہی نہ دے اس کی بھی وہی سزا ہوگی جو جھوٹی گواہی کی سزا ہے۔

اورفرمایا کہ: اللہ تعالی نے شراب سے متعلق دس شخصوں کو اپنی رحمت سے دورکردیا ہے، نچوڑنے والا، جس نے اس کی فرمائش کی، پینے والا، لانے والا، جس کے واسطے وہ لائی گئی، ساقی، بیچنے والا، اس کی قیمت لینے والا، خریدنے والا، جس کے لئے وہ خریدی گئی۔

اورفرمایا کہ: شرابی کو مرنے کے بعد نہر غوطہ سے پلایا جائے گا، صحابہؓ نے عرض کی نہر غوطہ کیا چیز ہے؟ فرمایا! دوزخ میں زناکار عورتوں کے فرجوں سے رطوبتیں بہیں گی جس کی بدبو سے تمام دوزخیوں کو اذیت پہنچے گی، وہ رطوبتیں شرابیوں کو پلائی جائیں

گی۔

اورفرمایا کہ: خدائے تعالی پرحق ہے کہ شرابی کونہرخبال سے پلائے، صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ نہر خبال کیا چیز ہے؟ فرمایا! دوزخیوں کی پیپ وغیرہ آلائش بہنے کی جگہ۔

اورفرمایا کہ: زنا کرنے والوں کے چہرے آگ سے ایسے جلتے رہیں گے جیسی مشعلیں، اورفرمایا! زنا کرنے والا بت پرست کے جیسا ہے، بتوں کو پوجنے والوں کی جو سزائیں ہیں محتاج بیان نہیں۔

اورفرمایا کہ: لوگوں کو دھوکہ دینے والے اوراحسان جتانے والے اور بخیل جنت میں داخل نہ ہوں گے۔

اورفرمایا: بندہ حسن خلق کی وجہ سے آخرت کے بڑے درجوں اور بلند مقاموں تک پہونچتا ہے، اور بد خلقی کی وجہ سے اس درجہ تک پہونچ جاتا ہے جو دوزخ میں سب سے نیچے ہے، اورفرمایا! بدخلقی سے بدتر کوئی گناہ نہیں۔

اورفرمایا: دو شخص تین روز سے زیادہ ترک ملاقات کریں اور آپس میں بات چیت موقوف کریں اوراسی حالت پر مرجائیں تو وہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔

ایک بار آنحضرت ﷺ جنت البقیع کو تشریف لے گئے جو مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کا مقبرہ ہے، اورایک مقام پر کھڑے ہوگئے جہاں دو قبریں نئی بنی تھیں اور پوچھا: کیا فلاں فلاں شخصوں کو تم نے ان قبروں میں دفن کیا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں

یارسول اللہ ﷺ! حضرتؐ نے فرمایا فلاں شخص بٹھلایا گیا ہے اور خدا کی قسم اس پر اس قدر مار پڑی کہ اس کا ہر عضو ٹوٹ گیا اور اس کی قبر میں آگ بھر گئی ہے اور اس نے اس زور سے چیخ ماری کہ سوائے انس وجن کے سب نے سنا، لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! ان کا کیا گناہ تھا؟ فرمایا: ایک شخص لوگوں کی غیبت کرتا تھا اور دوسرا پیشاب سے اپنے آپ کو بچاتا نہ تھا، لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ! کب تک ان پر عذاب ہوتا رہے گا؟ فرمایا اس کا حال سوائے خدا کے کسی کو نہیں معلوم۔

اور فرمایا: جو شخص لوگوں کو ہنسانے کی غرض سے ایسی بات کہے جو مرضی الٰہی کے خلاف اور باعث غضب ہو تو خدائے تعالیٰ اس سے کبھی راضی نہ ہوگا جب تک اس کو دوزخ میں نہ ڈالے۔

اور فرمایا: حسد نیکیوں کو ایسا کھا جاتا ہے جیسے آگ گھاس کو، اور فرمایا جو شخص سخت گو متکبر ہے وہ دوزخی ہے۔

اور فرمایا: دوزخ میں یہ لوگ داخل ہوں گے، وہ حاکم جو لوگوں پر مسلط ہو گیا ہو یعنی زبردستی اور ظلم کرتا ہو، وہ مالدار جو مال سے متعلق حقوق اللہ کو ادا نہیں کرتا، فخر کرنے والا فقیر، اور فرمایا! جس کے دل میں رائی برابر تکبر ہو اس کو خدائے تعالیٰ دوزخ میں ڈالے گا۔

اور فرمایا: ایماندار میں اور دوسری خصلتیں ہوں گی مگر خیانت اور جھوٹ نہیں ہوسکتیں، اور فرمایا: جھوٹ منہ کو کالا کرنے والا ہے اور چغلی باعث عذاب قبر ہے، اور

فرمایا: جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں، اور جس کو عہد واقرار کی پابندی کا پاس نہیں اس کو دین سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ تمام وعیدیں مسلمانوں سے متعلق ہیں کیونکہ نماز، روزہ وغیرہ فروع ہیں اور جب تک خدااور رسولؐ پر ایمان نہ لائے اس سے یہ احکام متعلق نہیں ہوتے، اب اگر یہ خیال کیا جائے کہ کوئی مسلمان دوزخ میں نہ جائے گا خواہ کتنے ہی گناہ کرے تو قرآن وحدیث کی تکذیب لازم آتی ہے، عقل بھی ہرگز یہ تسلیم نہیں کرتی کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کا مال زبردستی لے لے اوراس کی عورت وبچوں پر قابض ہوجائے اوراقسام کی اذیتیں ان کودے اوران کی بے حرمتی کرے، باوجوداس کے اس عالم میں کوئی سزااس کو نہ ہو۔

اصلاح تمدن ومعاشرہ:

حکماء نے اصلاح تمدن کے لئے تناسخ کا مسئلہ نکالا کہ جوشخص برے کام کرے ،مرنے کے بعد کسی ایسے جانور کے قالب میں اس کی روح جائے گی جونہایت ذلیل ہو ،ان کا مقصوداس سے یہی تھا کہ آدمی اس خوف کے مارے برے کام کا مرتکب نہ ہو، یہ ان کی تراشی ہوئی بات تھی، مگراس کا یہ اثر ہوا کہ کروڑہا آدمی اس خیال سے کہ مرنے کے بعد کسی برے جنم میں نہ جائیں برے کاموں سے بچنے لگے۔

خالق عالم نے کارخانۂ عالم کی بنیاد ہی ایسی ڈالی کہ اگرآدمی ذرابھی اس میں

غور وفکر کرے تو برے کاموں کو چھوڑ دے، چنانچہ دو عالم پیدا کئے ایک دارالعمل، دوسرا دارالجزاء جہاں جنت ودوزخ ہیں، دارالعمل میں جیسے کام کریں گے دارالجزاء میں ویسا ہی بدلہ ملے گا، اور پیغمبروں کو بھیج کر معلوم کروادیا کہ اچھے کام یہ ہیں اور برے کام یہ، اور قرآن شریف میں جگہ جگہ خبر دی کہ برے کاموں کی جزاء اس عالم میں دوزخ ہے، اب اگر یہ باور کرایا جائے کہ مسلمان جو چاہیں کریں وہ دوزخ میں نہ جائیں گے بلکہ بمصداق اس کے :

نصیب ہست بہشت اے خدا شناس برو — کہ مستحق کرامت گناہ گارانند

عابدوں اور زاہدوں سے بھی جنت میں اس کے مرتبے بڑھے ہوئے رہیں گے تو مسمانو ں کا تمدن ہندوؤں کے تمدن سے بدرجہا گھٹا ہوا رہے گا، کیونکہ مسلمانوں کے پیشوا یعنی واعظین نے ان کو اپنے کاموں کی جزاوسزا سے بے فکر بنا دیا تو اب ان کو کیا ضرورت کہ نفس کی مخالفت کرکے دنیوی نعمتوں اور عیش وعشرت سے محروم رہیں، جب جب بھی موقعہ ملے گا ناجائز ذرائع سے لوگوں کا مال حاصل کریں گے اور شہوت ونفسانی خواہشوں کے پورے کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے اب کہئے کہ ایسے مسلمانوں سے تمدن کو نفع پہونچے گا یا نقصان؟ پھر غیر اقوام کے مقابلہ میں جو کہتا ہے کہ ''اسلام اعلیٰ درجہ کا حامی تمدن ہے'' تو اگر وہ ایسے مسلمانوں کو پیش کردیں کہ جن کے ناشائستہ افعال سے معاشرہ وتمدن خراب ہورہا ہے تو ان کا کیا جواب؟ اگر کہا جائے کہ یہ ان کی ذاتی خرابیوں کا اثر ہے ہمارا دین ان کو ایسے امور کی ہدایت نہیں کرتا، تو وہ واعظین کو پیش کردیں گے

کہ ان کی ہدایتوں کا یہ اثر ہورہا ہے کہ لوگ بے باک ہورہے ہیں، ان کو یقین دلایا جاتا ہے کہ کیسے ہی کیسے برے کام کریں جنت کے اعلیٰ مقامات کے مستحق ہیں، وہ ضرور کہیں گے کہ اگر دین میں یہ بات داخل نہیں تو یہ پیشوایان دین پھر کہاں سے ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جس سے تمدن تباہ ہو؟ اس سے معلوم ہوا کہ معاذ اللہ ہمارا دین اسلام کامل نہیں، یہ سب خرابیاں اسی وجہ سے ہیں کہ واعظین قرآن وحدیث کے کل مضامین کو پیش نظر نہیں رکھتے ،قرآن شریف کو جہاں دیکھئے یہی ثابت ہوگا کہ وعدہ اور وعید برابر ہورہے ہیں جس آیت سے خوف پیدا ہوتا ہے، احادیث میں دیکھئے تو ان میں بھی یہی طریقہ مرعی ہے۔

الحاصل جب تک ہمارے واعظین جو پیشوایان قوم ہیں جس طرح آیات واحادیث رجاء کے بیان کرتے ہیں خوف پیدا کرنے والے آیات واحادیث نہ بیان کریں تو مسلمانوں کے تمدن کی اصلاح ہرگز نہیں ہوسکتی، ان حضرات کو اس آیت شریفہ میں غور کرنا چاہیئے جو حق تعالیٰ فرماتا ہے وَاتَّقوا اللّٰہ حَقَّ تُقَاتِہٖ یعنی اللہ تعالی سے ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ اہل سنت وجماعت کا مذہب بین الخوف والرجا ہے نہ اس میں افراط ہے کہ گنہگار قطعی دوزخی اور ہمیشہ دوزخ میں رہے گا جیسے کہ خوارج کہتے ہیں، اور نہ یہ ہے کہ مسلمان کو گناہوں کی کچھ سزا نہ ہوگی جیسا کہ مرجیہ کہتے ہیں مسلمانوں کو خوف اس وجہ سے لگا رہتا ہے کہ کسی آیت وحدیث میں یہ وارد نہیں ہے کہ

کل امت کوآنحضرتﷺ بالکلیہ دوزخ سے نجات دلادیں گےاورکوئی دوزخ میں نہ جائے گا ، بلکہ یہ وارد ہے کہ بہت سے مسلمان بغیراطلاع کے دوزخ میں ڈال دئے جائیں گے اور مدتوں اسی میں پڑے رہیں گے پھر جب آپ ؐکو اطلاع ہوگی تو آپﷺ دوزخ پرتشریف فرماہوکران کواس میں سے نکال لیں گے،اب یہ کیونکر یقین ہوکہ پہلی ہی شفاعت میں ہم ضرورشریک ہوں گے ،جب یہ اشتباہ ثابت ہوگیا تو ہر ایمان والےکویہ فکرلگی رہنی چاہئے کہ معلوم نہیں ہم کس زمرہ میں ہوں گے۔

ضرورت ترغیب وترہیب:

آج کل کے بعض مہذب مسلمان جب اس قسم کی احادیث سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ امام پرستی ہے کہ جنت اور دوزخ کے خیال سے عبادت کی جائے ،اگراس کا مطلب یہ ہے کہ عقلاء بالطبع اچھے کام کرتے ہیں اور برے کاموں سے احتراز کرتے ہیں تو یہ درست ہے مگرسب آدمی یکساں اوراس خیال کےنہیں ہوسکتے ،شاید ہزارمیں ایک آدمی ایسا بلندخیال ہوگا،باقی اپنی شہوت اورخواہشیں پوری کرنے میں اس کا خیال ہی نہیں کرتے کہ کون سا کام مقتضائے عقل کے مطابق ہےاورکون سا خلاف عقل،انہیں لوگوں سے تمدن خراب ہوتا ہے چونکہ ان لوگوں کی ہمت نفسانی خواہشوں کے پوری کرنے اورجسمانی لذات حاصل کرنے کی طرف مصروف ہے،اس لئے ان کووعدہ دیا

گیا کہ جنتی خواہشیں تمہاری تھیں جنت میں ایسے طور پر پوری ہوں گی کہ وہ تمہارے خیال میں بھی نہیں ہے بشرطیکہ جن کاموں کا حکم کیا گیا ہے وہ بجالائیں اور برے کاموں سے احتراز کریں ،اوراگر اس کے خلاف کروگے تو دوزخ میں ڈالے جاؤگے جہاں ایسے اقسام کے عذاب ہیں کہ دنیا میں ان کا خیال تک نہیں آ سکتا۔

جن لوگوں کو خدائے تعالٰی اور اس کے رسول ﷺ پر پورا ایمان ہے اور کلام الٰہی اور احادیث نبوی ؐ کو سچا جانتے ہیں وہ یقین کر کے ایسے کام کرتے ہیں جن سے جنت کا استحقاق پیدا ہوتا ہے ،اور جو یقین نہیں کرتے وہ دوزخ کے مستحق ہوتے ہیں،غرضکہ یہ ترغیب وتخویف ایسے ہی لوگوں کے واسطے ہے اور عالی فطرتوں کے لئے اس کی ضرورت نہیں، دیکھئے بادشاہی ملازمین میں بعض لوگ اس فطرت کے ہوتے ہیں کہ حسب مرضی شاہی سب کاموں کو انجام دیتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں تقرب حاصل ہوتا ہے،مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں ، بخلاف اس کے بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو اضافہ ماہوار وغیرہ کے ترغیب دینے کی اور ان کی تخویف کے لئے قید خانہ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے جہاں اقسام کے عذاب دئے جاتے ہیں ،اسی پر خدائی سلطنت کا خیال کیا جائے۔

انکار جنت ودوزخ کا منشاء:

اہل تہذیبِ جدیدہ اگرچہ اعلیٰ درجے کی بات کہتے ہیں کہ اعمال حسنہ وسیئہ کیلئے ورجاء اس قسم کی نہ ہونی چاہیئے بلکہ جو کام ہو خلوص سے خاص خدائے تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے ہو، چنانچہ اکثر اولیاء اللہ کا بھی یہی قول ہے، مگر فرق یہ ہے کہ اولیاء اللہ جنت و دوزخ کے قائل ہیں، بخلاف اس کے ان حضرات کا اندرونی منشا کچھ اور ہی ہے ،اکثر حکماء کا یہی مسلک ہے کہ جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں صرف روحانی لذائذ جو روحانیت کی تکمیل سے حاصل ہوتے ہیں ان کا نام جنت اور روحانی تکالیف کا نام دوزخ ہے جو روحانی کمالات حاصل نہ کرنے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

حکماء کی غرض یہی معلوم ہوتی ہے کہ زمین ایک بڑی مستحکم چیز ہے، جب ایک بار بن گئی تو اس کو خراب کر کے دوسرا عالم قائم کرنا ایک مشکل کام ہے، اس لئے انہوں نے مناسب سمجھا کہ دنیا کا کارخانہ یوں ہی چلنے دینا چاہیئے کہ ہمیشہ لوگ پیدا ہوتے رہیں اور آخرت کا کارخانہ علیحدہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں، صرف روح جہاں رہے وہیں اس کے لئے آسائش یا تکلیف رہے جس کو انبیاء جنت و دوزخ سے تعبیر کرتے ہیں ،انہوں نے دیکھا کہ جب عالم کا کارخانہ ایک مدت سے جاری ہے اور کوئی ایسا شخص انہیں نہ ملا کہ اس کے روبرو تخلیق عالم ہوئی ہو، اس لئے انہوں نے یہ خیال کیا کہ عالم قدیم ہے، اور یہ بھی تجویز کر لی کہ وہ کبھی فنا نہ ہوگا ، یہ صرف ان کا قیاس ہے اور چونکہ وہ قیاس الغائب علی الشاھد ہے اس لئے عقلاً جائز نہیں ہوسکتا ،اور جنتی دلائل قائم کی گئیں

ہیں ان میں کوئی دلیل ایسی نہیں جس کو عقل سلیم قبول کر سکے، کیونکہ یہ مسئلہ نظری ہے جس میں نظر وفکر کی ضرورت ہے، اور یہ بات قابل تسلیم ہے کہ جب تک نظریات کی انتہا کسی بدیہی پر نہ ہو دلیل مفید نہیں ہو سکتی، اب یہاں کونسی چیز ایسی بدیہی نکل سکے گی جس کے ذریعہ سے ہم قدیم عالم تک پہونچ سکیں۔

غرض کہ حکماء وفلسفیوں نے عالم کو جس قدر وقعت دے رکھی ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ وہ مخلوق ہے، اور ممکن نہیں کہ مخلوق خالق سے برابری اور ہمسری کا دعوی کر سکے، اسی کو دیکھ لیجئے کہ ہم مکان یا اور کوئی چیز بناتے ہیں تو باوجودیکہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اس کے خالق ہیں، کیونکہ مکان کے لئے مثلاً لکڑی، چونا، پتھر وغیرہ اشیاء جب تک پہلے سے موجود نہ ہوں ہم کچھ نہیں کر سکتے ان سب کا خالق خدائے تعالٰی ہے، ہمارا کام صرف اس قدر ہے کہ ان اشیاء کو خاص طور پر ایک جگہ جمع کر دیں جس پر مکان کا اطلاق ہو سکے، اب دیکھئے کہ باوجود خالق نہ ہونے کے ان اشیاء کا ہمارے روبرو کیا حال ہے جس طرح چاہتے ہیں لکڑی اور پتھر کو تراشتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں ان کو لگاتے ہیں کسی کو سرتابی کی مجال نہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ مثلاً ایک پتھر کو ہم بیت الخلاء میں لگانا چاہیں اور وہ انکار کرے، اب دیکھئے کہ باوجودیکہ یہ اشیاء موجود اور ہمارے ہمسر ہیں اس وجہ سے کہ جس طرح خدائے تعالٰی نے ہمیں پیدا کیا انہیں بھی پیدا کیا، مگر چونکہ ہم کو ان پر ایک قسم کا تسلط دیا گیا ہے وہ ہم سے سرتابی نہیں کر سکتے اور ہماری قدرت سے مکان وجود میں آجاتا ہے، اسی پر غور کیجئے کہ مخلوق کو خالق کے ساتھ کسی قسم کی ہمسری

نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ بالذات موجود ہے اور یہ معدوم، جب خالق کسی شئے کو عدم سے وجود میں لانا چاہتا ہے تو وہ شئے اس کے روبرو اس سے بھی زیادہ ذلیل اور منقاد ہے جو ہمارے روبرو مکان کے اجزاء ہوتے ہیں، صرف خدائے تعالٰی کا ارادہ ہونے کی دیر ہے، جہاں کسی چیز کے پیدا کرنے سے ارادہ متعلق ہوا تو پھر ممکن نہیں کہ وہ چیز وجود میں نہ آئے یا آنے میں تاخیر کرے، کیونکہ اگر کسی چیز کے بننے میں تاخیر ہوتی تو وہ بنانے والے کی وجہ سے ہوتی ہے، بنانے والا ذی اثر اور باقدرت ہو تو وہ چیز بہت جلد تیار ہوگی ،مثلاً معمولی مقدرت والا جس مکان کو ایک مہینے میں بنا سکتا ہے تو بڑی مقدرت والا اگر چاہے تو دو تین روز میں بنا لے گا۔

مخلوق اگر کسی چیز کو بنائے تو خواہ مخواہ دیر ہوگی کیونکہ آلات واسباب فراہم کرنے میں ضرور دیر ہوتی ہے، بخلاف اس کے اگر خالق عز وجل جب کسی چیز کو بنانا چاہتا ہے تو وہاں پر نہ آلات کی ضرورت ہوتی ہے نہ اسباب کی، بلکہ فقط ''موجود ہوجا'' کہہ دینا کافی ہے، چنانچہ ارشاد ہے اِنَّـما قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ اب غور کیجئے کہ مخلوق کس قدر خالق کے روبرو ذلیل اور منقاد ہے کہ صرف ''کن '' کہہ دینے سے وجود میں آجاتی ہے جب ہر چیز کا یہی حال ہے جن کا مجموعہ عالم ہے تو ظاہر ہے کہ عالم خدائے تعالٰی کے روبرو نہایت ذلیل اور منقاد ہے، اور اس کی ہستی ہی کیا کہ خدائے تعالٰی کی ہمسری کا دعویٰ کرسکے۔

غرضکہ عقلاً یہ بات ثابت ہوسکتی ہے کہ عالم کو خدائے تعالٰی کے مقابلہ میں

کوئی وقعت نہیں، بلکہ نہایت ذلیل حالت میں ہے،صرف ایک لفظ کے کہنے سے وجود میں آسکتا ہےاور ایک لفظ کے کہنے سے فنا ہوسکتا ہے، جب یہ بات قابل تسلیم ہےتو کہنا پڑے گا کہ خدائے تعالٰی نے جس طرح اپنے ارادہ اور اختیار سے عالم کوموجود کیا اسی طرح اس کواپنے ارادہ اوراختیار سے فنا بھی کرسکتا ہے،جس کی خبرقرآن شریف میں دی ہے،اس کے بعد یہ خیال کرنا کہ زمین وآسمان ہمیشہ باقی رہیں گےاور روحانی دنیا کے لئےکوئی ٹھکانے یعنی جنت ودوزخ کی ضرورت نہیں، یہ قرآن شریف کی تکذیب کرنی ہے۔

بِ

یہ حروف جار ہےاورجس پر داخل ہوتا ہےاس کو مجرور کہتے ہیں''جار''لغت میں کھینچنے والےکو کہتے ہیں،اور''مجرور''وہ جو کھینچا جائے، جارمجرورکا تعلق کسی فعل سے یا صیغۂ صفت سے ہوتا ہے،اگر ظاہراً کوئی فعل یا صیغۂ صفت نہ ہوتواس کومقدرکرنے کی ضرورت ہوتی ہے جیسے''زَیْدٌ فِی الدَّارِ''میں ثبت یا ثابت فی الدار سمجھا جاتا ہے،جب تک جارمجرورکاتعلق فعل یا صیغۂ صفت سے نہ ہوعبارت درست نہیں ہوسکتی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ عبارت کا ایک عالم ہی جدا اور مستقل ہے جس میں بے انتہا افرادموجودہوئے اور ہوتے جاتے ہیں،اس عالم کاتعلق فہم وادراک اورسامعہ سے ہےاور بواسطۂ نقوش باصرہ سے بھی ہوسکتا ہے،باقی دوسرے حواس کواس عالم میں

رسائی نہیں ، یہ عالم عبارت دراصل جلوہ گاہ عالمِ معنی ہے یعنی معنی تنزل کر کے عالمِ عبارت میں آجاتا ہے ، پھر اس عالم میں اس کی مختلف اشکال ہوتی ہیں ، ایک شکل کو دوسری شکل سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔

مثلاً جب آدمی چاہتا ہے کہ کوئی اسے پانی پلائے تو کسی کو مخاطب کر کے ہندی ہوتو یہ کہے گا کہ ''مجھے پانی پلاؤ'' اور عرب ہوتو ''اسقنی الماء'' اور فارسی ہوتو ''مرا آب بنو شاں'' کہے گا، علیٰ ہذا القیاس ہر ملک کا آدمی اپنی زبان میں اسی مقصود کو ظاہر کرے گا، اگر چہ بحسب اختلاف السنہ صدہا قسم کی عبارتیں اس مضمون کی بنائی جائیں گی ، جس کو اس زبان کے جاننے والوں کے سوا کوئی دوسرا نہ جانے گا، مگر دل میں سب کے ایک ہی قسم کی بات ہوگی یہاں شاید یہ خیال پیدا ہوگا کہ ہندی کے دل میں بھی ہندی الفاظ ہوں گے مگر یہ صحیح نہیں ، اس لئے کہ جانور کے دل میں بھی یہ بات موجود ہوتی ہے جیسا کہ آثار اور قرائن سے ثابت ہے حالانکہ اس کے دل میں کسی لفظ کا وجود نہیں ہے کیونکہ لفظ مایتلفظ بہ الانسان کو کہتے ہیں۔

اس کے سوا یہ امر بھی قابل تسلیم ہے کہ جب کوئی شخص اعتراض کرتا ہے تو بسا اوقات اس کا جواب بھی سوجھ جاتا ہے اور بمجرد اس کے ذہن میں اجاگر ہونے کے آدمی پر آثار بشاشت نمایاں ہوتے ہیں اور فوراً مقابل کو کلام سے روک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا جواب میرے خیال میں آگیا ، جس وقت اس جواب کا خطور ہوتا ہے اس وقت کو اگر آدمی غور سے دیکھے تو ایک آن سے زیادہ نہ پائے گا ، اس آنی کلام کو ''کلام نفسی'' کہتے

ہیں،اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ گویا ایک بجلی ہے کہ کوندگئی اور جس مقام میں کوندی اس کومنور کردیا،اور وہ کلام نفسی جوآنی ہوتا ہے جب بیان کیا جاتا ہےتو بہت دیر تک اس کی تقریر کی جاتی ہے،اب کہئے کہ اس آن میں جو جواب کا خطور ہوا یہ سب الفاظ جودیر تک بیان کئے جاتے ہیں کہاں ہیں؟۔

کلام نفسی:

الحاصل اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ دل میں جو مضمون آتا ہے اس کو الفاظ کی شکل نہیں ہوتی ،وہ ایک اجمالی کیفیت ہے،مگر چونکہ اسی کو مفصل بیان کرتے ہیں اس وجہ سے بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی ہندی ہوتو اردو الفاظ اس کے دل میں ہوں گے اور کوئی عرب ہوتو عربی حالانکہ صحیح نہیں کیونکہ جب جانوروں کے دل میں بھی باتیں ہوتی ہیں اور لفظ مفقود ہیں تو معلوم ہوا کہ الفاظ کا وہاں کچھ دخل نہیں ہے،مگراس کا انکارنہیں ہوسکتا کہ کوئی چیز وہاں ضرور ہے جس کو عبارت میں لاتے یا الفاظ میں بیان کرتے ہیں،اسی کو''کلام نفسی'' کہتے ہیں۔

اب اس کلام نفسی پر غور کیجئے کہ جس طرح عوارض جسمانی سے معرا ومنزہ ہے نہ اس میں حروف ہیں جن کے بنانے میں زبان وحلق ودہان ولب کے استعمال کی ضرورت ہواوران کی تقدیم وتاخیر ہوسکے،نہ صوت ہے جس میں ہوا کی طرف احتیاج ہو،اس حالت تنزیہی سے وہ کلام نفسی تنزل کر کے فضائے ذہن میں جلوہ گر ہوتا ہے،حلق

سے لے کر ہونٹوں تک اس کی دارالسلطنت ہے،اس کے تولد کی یہ کیفیت ہے کہ زبان ایک ایک جگہ لگتی جاتی ہےاور ایک ایک حصہ اس کا وجود میں آتا جاتا ہےاور بعض حصوں کو حلق اورلب وغیرہ بناتے ہیں۔

کلام لفظی:

اب یہاں ایک لطف خاص قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ زبان اکثر حرکت کرتی رہتی ہےاوران تمام مقامات پرلگتی بھی ہے مگر کوئی حرف وجود میں نہیں آتا جب تک حلق کے اندر سے ہوا خاص طور پر باہر نہ آئے جس سے آواز کا وجود ہو،غرض کہ آواز جو دراصل ہوا ہے جب حلق سے باہر آتی ہے اس وقت ان تمام حرکات زبان وغیرہ سے آواز میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے کلام کا وجود ہوتا ہے،سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ زبان تمام حرفوں کے مخارج پر لگنے اور حلق وغیرہ کے حرکت کرنے سے بھی حروف پیدا نہیں ہوتے بلکہ ہوائے خاص یعنی آواز کے وجود سے ان سب کا ظہور ہوجاتا ہے۔

مثالِ اعیانِ ثابتہ:

یہ بعینہ ایسا ہے جیسے اعیان ثابتہ اپنے مقام میں یعنی عدم میں رہتے ہیں اور وجود کی معیت کے ساتھ ہی ان کا ظہور ہوجاتا ہے،دیکھئے عالم حروف ایک محسوس عالم

ہے جس میں ہر ایک حرف دوسرے حروف سے متشخص اور ممتاز ہے ان حروف کا جو ظہور ہو رہا ہے وہ صرف آواز کی بدولت ہے، اگر آواز نہ ہو اور زبان وغیرہ تمام حروف کے اعیان کو ثابت کر دیں تب بھی وہ سب معدوم ہی رہیں گے، اس لئے کہ عالم محسوسات میں اگر ان کا وجود ہی نہ ہوا تو کسی کو خبر بھی نہ ہوگی کہ ان کا ثبوت بھی ہے یا نہیں، البتہ نفس ناطقہ نے جب زبان وغیرہ کی حرکت سے ان کو فی نفسہ ممتاز بنا دیا تو وہ جانتا ہے کہ کہاں کہاں کس کا تعین ہے، پھر جب ان کو وجود دینا منظور ہوتا ہے تو زبان وغیرہ کو حرکت دیتا ہے جو بمنزلۂ کلمہ ''کن'' کے ہے اور وہ آواز کی معیت سے وجود میں آجاتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ حروف کے اعیان ثابتہ اپنے مقام سے علحدہ نہیں ہوتے، کیونکہ مثلاً لام جس مقام میں بنتا ہے نہ وہ مقام منہ سے باہر آیا نہ وہ کیفیت جو زبان کے اتصال مقامی سے پیدا ہوئی۔

وجود محسوس نہیں:

البتہ اس عین ثابت کا ظہور عالم محسوسات میں ہو جاتا ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مثلاً لام عالم محسوسات میں پیدا ہو گیا، حالانکہ وہ وہیں ہے جہاں اس کا ثبوت تھا مگر ہوا یہ کہ آواز نے ان حروف کو عالم محسوسات میں ظاہر کر دیا، یہاں لطف خاص یہ ہے کہ آواز اور حروف سنے جاتے ہیں اور اصل ہوا کو کوئی سنتا ہی نہیں بلکہ وہ غیر محسوس ہے

حالانکہ آواز کا مدار اسی پر ہے! کیونکہ آواز ہوائے مکیفہ کا نام ہے، یہی حال عالم کا ہے کہ کیفیات وجود محسوسی ہیں مگر وجود محسوس نہیں، ہوا کا استعمال کس موقع پر کتنی نکالی جائے جس سے صرف خود آپ ہی یا نزدیک والا یا دور والا سن سکے ایک عجیب کام ہے اس کا طریقہ کوئی حکیم بتا نہیں سکتا بلکہ الہامی ذریعہ سے خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔

پھر زبان کی اعجوبہ کاریاں بھی قابل دید ہیں کہ اس سرعت کے ساتھ وہ حرف بناتی ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی حیران ہو جاتا ہے، تیس چالیس مقامات پر فوراً گزر کر کے بات کا بنانا اسی کا کام ہے، اگر چہ وہ ایک مضغۂ گوشت ہے مگر نفس ناطقہ کی تحریک سے بہت آسانی سے اپنا کام انجام دیتی ہے، اور نفس ناطقہ کی کارگزاری بھی اس وقت قابل دید ہے کہ ایک ایک حرف پر زبان کے عضلات واوتار وغیرہ کو کبھی کھینچ کر اور کبھی چھوڑ کر اور کبھی زبان کو پھیلا کر اور کبھی دراز کر کے اس سرعت سے کام لیتا ہے کہ عقل حیران ہو جاتی ہے، پھر یہ بھی نہیں کہ صرف زبان ہی کی طرف اس کی توجہ ہو بلکہ ادھر یہ کارخانہ جاری ہے اور ادھر مضامین سوچتا رہتا ہے کہ کس مضمون پر کس عبارت کا لباس پہنا جائے ،یا یوں کہئے کہ ادھر کلام کے اعضاء بنا تا

جاتا ہے اور ادھر اس میں جان پھونکتا جاتا ہے کیونکہ الفاظ میں معنی بمنزلۂ جان کے ہیں ،بہر حال یہ دونوں کام ایک ہی وقت میں نفس ناطقہ کرتا ہے، اور اس کے ساتھ حلق سے ہوا کو بھی نکالتا جاتا ہے تا کہ جو حروف منہ میں بن رہے ہیں اس میں لپٹ کر منہ سے باہر آجائیں اور جو مقصود ہے پورا کریں، یہاں بھی ایک عجیب تماشا ہے کہ جو ہوا حلق کے

باریک سوراخ سے نکلتی ہے اس کے ساتھ کلام منہ کے باہر نکلتا ہے اور نکلتے ہی اتنی ہوا پر اپنا تسلط کرلیتا ہے جو ایک وسیع میدان میں بھری ہوتی ہے، اگر دس ہزار آدمی بھی اس میدان میں ہوں تو بھی بحسب قوت آواز وہ کلام کانوں میں چلا جاتا ہے، ہر چند وہ ہوا جس میں کلام رہتا ہے سب کے جسم سے لگتی ہوئی ہے، مگر جسم کے کسی حصہ کو خبر نہیں ہوتی کہ اس ہوا میں کلام ہے، اگر خبر ہوتی ہے تو صرف کان کے آخری حصہ کو حالانکہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو جسم کے کسی حصہ میں نہ ہو، اگر عصب سے سماعت کا کام متعلق ہے تو وہ بھی تمام جسم میں مفروش ہے، مگر بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام اعصاب میں سے اس عصب سے جو کان میں مفروش ہے سماعت کو متعلق فرمادیا ہے جس سے کلام کی پوری حالتوں پر اس کو اطلاع ہوجاتی ہے، اور دوسرے کل اعضاء اس سے بے خبر ہیں کیونکہ ان کو اس عالم سے تعلق ہی نہیں۔

ادنی تامل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ ایک عالم ہی مستقل ہے ابتداءً بات دل میں پیدا ہوتی ہے پھر منہ میں آکر ایک نئی شکل قبول کرتی ہے پھر ہوا کے ذریعہ سے باہر نکلتی ہے اور ایک حد معین تک سننے والوں کے کانوں میں پہونچتی ہے اور

وہاں سے ان کے دل میں اترتی ہے، ابتداء سے انتہا تک اندرونی تعلقات اور مناسبتیں باہمی کچھ ایسی ہیں کہ ان کے ادراک سے عقل قاصر ہے، کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عصب یعنی پٹھا سنتا ہے یا سننے کا ذریعہ بن سکتا ہے! بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ان کو کان بھی ہیں اور کان میں پٹھے بھی ہیں مگر سماعت مفقود، اور زبان بھی ہے اور حرکت بھی

کرتی ہے مگر بات کے بنانے کی صلاحیت ندارد۔

عقلاء نے بات کو مقید کرنے کا آلہ تو بنالیا ہے مگر اب تک کوئی ایسا آلہ تیار نہ ہوسکا کہ اپنے دل کی بات اس کے ذریعہ سے بیان کریں، حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ حلق سے ہوا نکلتی ہے اور چند کھٹکوں سے حروف تیار ہوتے ہیں اور ہوا کے ذریعہ سے وہ کان تک پہونچتے ہیں، ہوا موجود ہے اور ربڑ کی زبان بھی بنا سکتے ہیں اور ہوا کو تموج دینے کی تدابیر بھی معلوم ہیں مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ منہ کی شکل بنا کر اس سے بات کرلیں، اگر ایسا آلہ نکالا جائے تو گونگوں کو بہت بڑا فائدہ ہو، ایسے کام لینے کی تدابیر امریکہ وغیرہ میں اقسام کی کی جارہی ہیں مگر اتنا سہل کام اب تک نہ ہوسکا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرف وصوت وسماعت کا عالم ہی جدا ہے جس کے اسرار پر اب تک کسی کو اطلاع نہیں۔

اس عالم میں آواز بھی ایک چیز ہے جو حلق سے نکالی جاتی ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب چاہتے ہیں سوائے شخص قریب کے کوئی نہ سنے تو اس کو پست کرسکتے ہیں، اور جب اوروں کو بھی سنانا منظور ہوتا ہے تو بلند کرتے ہیں، پھر اس میں بھی مدارج ہیں سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کو سنا سکتے ہیں۔

اب آواز کو پست وبلند کرنے والوں سے پوچھا جائے کہ کس تدبیر سے آواز پست وبلند کی جاتی ہے؟ تو کوئی بتا نہ سکے گا، حکماء یہ کہہ تو دیں گے کہ عضلات وغیرہ کو خاص خاص قسم کی حرکت دی جاتی ہے، مگر حرکت دینے کی تدبیر کوئی بتا نہ سکے گا، حالانکہ جاہل جس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ حلق میں کوئی عضلہ بھی ہوتا ہے وہ بھی اپنی آواز کو پست

وبلند کرتا ہے، اب کہئے کہ اس کو یہ تدبیر جو عمل میں لاتا ہے کس نے بتائی ؟ نفس ناطقہ تو کیا اس کے فرشتے کو بھی معلوم نہیں کہ کس تدبیر سے عضلات واعصاب کو حرکت دیتے ہیں، بلکہ یہ بھی خبر نہیں کہ عضلات کا وہاں وجود بھی ہے یا یوں ہی کہا جاتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ طبیعت یہ کام کرتی ہے تو ہم کہیں گے کہ طبیعت نفس ناطقہ کے ماتحت کام کرتی ہے جب نفس ناطقہ ہی کو معلوم نہیں تو بے شعور طبیعت کو کیونکر معلوم ہو! عقلاء کا دستور ہے کہ جس سررشتہ کے انتظام کے لئے عملہ مقرر کرتے ہیں تو پہلے ایسے افسر اعلیٰ کی تلاش کرتے ہیں کہ اس سررشتہ کے تمام کاموں کا ماہر ہو اور اس کے ماتحت افسران اس سے کم درجہ کے ہوتے ہیں جب حق تعالیٰ نے نفس ناطقہ کو اس سررشتہ کالبد انسانی کا افسر اعلیٰ مقرر فرمایا تو اس کا علم اس کے ماتحتوں کے علم سے زیادہ ہونا چاہئے! حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ نفس ناطقہ کو اس کا علم ہی نہیں، کیونکہ ہماری جس قدر ادراکات ہیں وہ سب ہمارے نفس ناطقہ ہی کے ادراکات ہیں، اگر ہمارا نفس ناطقہ جانتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں جب اس تدبیر کو ہم نہیں جانتے ہیں

تو ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا نفس ناطقہ بھی نہیں جانتا، اور جب نفس ناطقہ ہی نہیں جانتا تو طبیعت بھی نہیں جانتی، کیونکہ خود حکماء کو اعتراف ہے کہ طبیعت بے شعور محض ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عالم کلام کے کارخانے کو خدائے تعالیٰ نے صرف اپنے ہی تصرف میں رکھا ہے جب چاہتا ہے بات کرادیتا ہے، مگر چونکہ عادت ہوگئی ہے کہ ہم جب ارادہ کرتے ہیں تو بات کرلیتے ہیں، اس وجہ سے خیال تک نہیں آتا کہ خدائے

تعالٰی کو بھی اس کارخانہ میں دخل ہے یا نہیں، یہ ہر شخص جانتا ہے کہ آدمی جب کسی ایسے کام کا ارادہ کرتا ہے جن میں آلات کے استعمال کی ضرورت ہو تو پہلے ان آلات کے استعمال کا طریقہ سیکھتا ہے، اور جب تک وہ معلوم نہ ہوگا ہرگز نہیں کرسکتا، بخلاف اس کے بات کرنے کا ارادہ جب کرتا ہے تو بغیر اس کے کہ آلات یعنی عضلات وغیرہ کے استعمال کرنے کا طریقہ معلوم ہو بات کرلیتا ہے، اب کہئے کہ کیا صرف ارادہ بات کرنے کے لئے کافی ہوسکتا ہے؟ میری رائے میں عقل کی رو سے تو ہرگز کافی نہی ہوسکتا، کیونکہ جب معلوم ہوگیا کہ نفس ناطقہ اور طبیعت طریقہ استعمال آلات کو جانتے ہیں نہیں، تو یہ کہنا پڑے گا کہ ارادہ تو ہم کرتے ہیں مگر اس کام کا وجود کسی اور کے ارادہ سے ہوتا ہے یعنی خالق عالم اس فعل کو وجود میں لاتا ہے۔

اسی پر ہمارے تمام افعال کو قیاس کر لیجئے! اسی وجہ سے اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے کہ خالق افعال اللہ تعالی ہے اور کلام الٰہی سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔

الحاصل جو بات دل میں پوشیدہ تھی جس کو کوئی نہیں جانتا تھا جب اس کو عالم شہود میں لانا منظور ہوا تو ہوا کے ساتھ وہ مخلوط کی گئی کیونکہ عالم محسوسات بہ نسبت عالم معنی کے کثیف ہے، اب اس نے اپنے مقام سے اس قدر تنزل کیا کہ ہزار ہا آدمی اس کو مشاہدہ کرنے لگے اور محسوسات میں داخل ہوگئی، مگر اب بھی اس کا مشاہدہ ایک مخصوص طور پر ہے کہ صرف کانوں کو خبر ہے آنکھ وغیرہ اعضاء کو کچھ خبر ہی نہیں کہ اس کا وجود بھی

عالم میں ہے یا نہیں کیونکہ کلام کی تجلی کانوں کے ساتھ مختص ہے اور کان بھی سب نہیں بلکہ وہی جن کو ان کا احساس دیا گیا ہے۔

اب دیکھئے کہ کلام ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ظاہر سماعت پر اور باطن اوروں پر مگر یہاں پر قیاس نہ کیا جائے کہ حق تعالٰی کا ظہور وبطون بھی ایسا ہی ہے کیونکہ حق تعالٰی کی ذات وصفات ایسی نہیں کہ کوئی ان کے مشابہ ہو سکے، حق تعالٰی فرماتا ہے لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ۔

کلام باطن سے تھوڑی دیر کے لئے ظہور کر کے کانوں کی راہ سے پھر باطن میں چلا جاتا ہے، اور جس طرح ابتداء میں کلام نفسی تھا اب بھی سامع کا کلام نفسی بن جاتا ہے ، اور حروف وصوت سب باہر رہ جاتے ہیں بلکہ فنا ہو جاتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حروف وصوت کی تدبیر صرف اسی غرض سے کی گئی تھی کہ دل کی بات دل میں پہونچ جائے۔

ہم نے اوپر جو کہا تھا کہ کلام نفسی حروف وصوت سے منزہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً جب کسی کو کہا جاتا ہے کہ: ’’پانی پلاؤ‘‘ تو اس وقت صرف یہ ہوتا ہے کہ پانی کی صورت ذہن میں آتی ہے اور ’’پلاؤ‘‘ کی اگر چہ یہ بات بظاہر سمجھ میں نہ آئے گی کہ ’’پلاؤ‘‘ امر کا صیغہ ہے اس کی کیا صورت ہوگی ؟ مگر جس وقت یہ کلام کیا جاتا ہے اس وقت نفس ناطقہ میں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ پلانے کی طلب وخواہش سامع سے ہوتی ہے جس کو عبارت میں لایا جائے تو لفظ ’’پلاؤ‘‘ یا ’’بنوشان‘‘ یا ’’اسقنی‘‘ وغیرہ بنایا جائے گا

جس طرح اشیائے خارجیہ کی صورتیں ذہن میں ہوتی ہیں ایسے ہی افعال وغیرہ کی صورتیں بھی ہوتی ہیں، دیکھئے ''پلاؤ'' اور ''پلایا'' کے معنی ہر شخص سمجھتا ہے کہ جدا جدا ہیں اگر اس میں ہر ایک کے معنی علحدہ نہ ہوں تو ان کے لئے علحدہ علحدہ الفاظ کیوں قرار دئے جاتے ہیں، بہرحال ان الفاظ کے معنی کا تصور ہر شخص کو ضرور حاصل ہوتا ہے، اور جب ان کی کوئی صورت ہی نہ ہو تو تصور کیونکر ہو سکے، غرض کہ پانی کی اور پلاؤ کی صورت پہلے ذہن میں آتی ہے اس طور پر کہ جملہ انشائیہ بنتا ہے اگر مخاطب اس خطاب کو سمجھ سکتا تو حرف وصوت سے کلام بنانے کی ضرورت نہ ہوتی اور مقصود پورا ہو جاتا۔

اگر فرض کیا جائے کہ دو صاحب کشف قلوب کسی مقام میں ہوں تو ان کو کلام لفظی بنانے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی اندر ہی اندر دونوں کی باتیں اور مخاطبہ ہوتا جائے گا جیسا کہ کسی بزرگ نے فرمایا ہے:

دو کس را کہ باشد بہم جان و ہوش
حکایت کنانند وایں ہا خموش

غرضکہ جو صورت کلام دل میں ہوتی ہے اس کو دوسرے کے ذہن میں منتقل کرنے کی غرض سے الفاظ بنائے جاتے ہیں، گو وہ صورت کلام نفسی صورت الفاظ میں جلوہ گر ہوتی ہے و بسواری ہوا کانوں کے ذریعہ سے دوسروں کے ذہن میں جاتی ہے۔

اگر کسی میں یہ قوت ہو کہ اپنے کلام نفسی کو دوسرے کا کلام بنا سکے تو اس کو حرف وصوت کی کوئی ضرورت نہیں، چنانچہ کسی بزرگ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ خود وعظ نہیں

کہتے تھے مگر جب ان سے اصرار کیا گیا تو انہوں نے ایک جاہل کو منبر پر بٹھادیا اور آپ اس کی طرف متوجہ ہو گئے اس نے ایسا فصیح و بلیغ پر اثر وعظ کہا کہ لوگ حیران ہو گئے بعد وعظ جب اس سے پوچھا گیا تو وہ ان مضامین سے بالکل نا آشنا تھا

انبیاء علیھم الصلوۃ والسلام پر جو وحی آتی تھی اس کا بھی یہی حال تھا کہ بذریعہ فرشتہ ان پر کلام نفسی الٰہی کا القاء ہوتا تھا جس کا ظہور کلام لفظی کے صورت میں عمل میں آتا یہی وجہ ہے کہ کلام اللہ شریف کو جنابت کی حالت میں پڑھنا جائز نہیں، اور اس کے بعد صورت مکتوبی میں اس کا تنزل ہوا اسی وجہ سے بغیر طہارت کے اس کو ہاتھ لگانا درست نہیں اسی طرح جس صورت میں اس کا تنزل ہوا واجب التعظیم ہے اسی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فوٹو گراف کی تختیوں اور ٹیپ ریکارڈ کے فیتے وغیرہ میں جو خطوط یا نشان ہوں جن سے قرآن کی آواز نکلتی ہے تو ان کو بھی بغیر طہارت کے ہاتھ لگانا درست نہ ہوگا کیونکہ ان ہی خطوط پر آلہ سے آواز نکلنے کا مدار ہے جس سے ظاہر ہے کہ ان خطوط میں وہ موجود ہے۔

کلام اس میں تھا کہ عالم عبارت جلوہ گاہ عالم معنی ہے سو اس کا حال کسی قدر معلوم ہو گیا، اب یہ معلوم کرنا چاہئے کہ عبارت میں ''جار'' کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی اسم، فعل یا شبہ فعل سے مربوط نہ ہو تو جار آکر اس کو مربوط اور متعلق کر دیتا ہے، مثلاً صلٰی زیدٌ فی الدار میں اگر ''فی'' نہ لایا جائے اور صلٰی زیدٌ الدار کہیں تو بالکل غیر مربوط ہوتا ہے اس لئے ''فی'' لایا گیا تا کہ دار کو کھینچ کر

''صلی'' کی طرف لے جائے اور جو اس کو اس فعل سے بالکل اجنبیت ہے دور کر کے خاص طور پر اس سے متعلق کردے، اس عبارت کو دیکھئے صلّٰی زید یوم الجمعة وقت الظهر سنة فلان قائماً مع رفقائه مخضوع وخشوع فی الدار باوجودیکہ ''دار'' ''صلی'' سے کتنی دور ہے اور ممکن ہے کہ مزید قیود وعبارت بڑھا کر اس سے بھی زیادہ دور کردیں، مگر جار اس کو اس قدر نزدیک کردیتا ہے کہ جتنے موانع اور حواجب ہیں ان میں سے کوئی اس کے تعلق کو قطع نہیں کرسکتا۔

اسی طرح مرشد کامل جو جار الی اللہ ہے یعنی خدائے تعالیٰ کی طرف مرید کو کشاں کشاں لے جاتا ہے اور مرید اس طرف کھینچ جاتا ہے جس پر لفظ ''مجرور'' پورے طور پر صادق آتا ہے اور مرید کو ایسی قربت حاصل ہوتی ہے کہ درمیانی اسباب ووسائط اس کی نظروں سے ساقط ہوجاتے ہیں، اور باوجود بعد کے تعلق قلبی اس کا ایسا ہوتا ہے کہ معنی نزدیک ہوجاتا ہے، ضروری اور پہلا کام مرشد کا یہ ہوتا ہے کہ افعال الٰہیہ وصفات الٰہیہ سے اس کو متعلق اور مربوط کردے تاکہ جملہ افعال وحرکات وسکنات عالم کو افعال الٰہی سمجھے، ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ یُمۡسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلاً وَلَئِنۡ زَالَتَا اِنۡ اَمۡسَکَهُمَا مِنۡ اَحَدٍمِنۡ بَعۡدِهٖ ''خدائے تعالیٰ ہی نے زمین اور آسمان کو گرنے سے روک رکھا ہے، اور اگر وہ گر پڑیں تو خدا کے سوا ان کو کون روک سکتا ہے؟ یہ تو سکنات سے متعلق فعل الٰہی ہے، اور حرکات کا تعلق اس سے ظاہر ہے کہ لاتتحرک ذرة الا باذن اللہ مقصود یہ ہے کہ مرید جملہ حرکات

وسکنات کوخدائے تعالی کے افعال یا آثار افعال سمجھے، جب یہ امر مرید کے نصب العین ہواوراس کا مشاہدہ ہونے لگے تو دل جمعی ہو جائے گی اور وہ پریشانی جو ہم لوگوں کو ہوتی ہے کہ فلاں شخص ہمارا دشمن ہے مبادا کہیں ضرر نہ پہنچادے! جس سے بچنے کی تدابیر میں وقت ضائع ہوتا ہے اوراس میں خدائے تعالی سے جو بے تعلقی ہوتی ہے اور اقسام کی مصیبتیں اور پریشان فکریں لاحق ہوتی ہیں وہ سب دور ہو جائیں گی اور باطمینان خاطر یاد الٰہی میں مشغول ہوگا ،اسی طرح دوستوں کو راضی کرنے اور ان کی آؤ بھگت میں باقتضائے بشریت جو وقت صرف ہوتا ہے اور تعلق قلبی ان سے منافع حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے جس کی وجہ سے حق تعالی سے بے تعلقی ہو جاتی ہے وہ دفع ہو جاتی ہے،اس وقت نافع وضار وہ حق تعالی ہی کو سمجھتا ہے اگر خوف ہے تو اسی سے ہے اور امید ہے تو اسی سے،اسی طرح جتنے کام دنیا میں ہوتے ہیں سب کا دارومدار اسی پر اور سب کا خالق اسی کو سمجھتا ہے،جس سے ''یک در گیر محکم گیر'' کا مضمون اس پر صادق آجاتا ہے اسی کو''توحید افعالی'' کہتے ہیں۔

غرضکہ پیر مرید کو کھینچ کر توحید کی طرف لے جاتا ہے مگر اس کو اوائل میں بڑی بڑی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں ،کیونکہ لڑکپن سے مشاہدہ ہو رہا ہے کہ دوست نفع پہونچاتا ہے اور دشمن ضرر ،اور نافع وضار چیزیں ممتاز ہیں جن کا ہر وقت یکساں اثر ہوتا ہے،مثلاً زہر کو جو کوئی کھائے اس کو ضرر ہوگا خواہ کچھ بھی اعتقاد رکھے،اسی طرح پانی سے ضرور تشنگی رفع ہوتی ہے،طبیعت اس دوامی مشاہدہ کی عادی ہوگئی ہے کہ ہر اثر کو

اس چیز کی طرف منسوب کرے جس کا بحسب تجربہ ومشاہدہ اثر ہوتا ہے۔

اب اس طبعی امر کو چھوڑ کر ہر بات میں اللہ تعالی کو مؤثر سمجھنا کوئی معمولی بات نہیں، یوں تو ہر عامی شخص بھی یہی کہہ دیتا ہے کہ خدا ہی سب کچھ کرتا ہے اور یہ خدا کے کام ہیں، مگر کہنے کہنے میں فرق ہے ایک کہنا وہ ہے کہ اس کا تعلق صرف زبان سے ہوتا ہے جہاں دل لگی میں اور باتیں ہوتی ہیں ان میں ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں ،اور ایک کہنا یہ ہے کہ اس کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ ہر فعل میں بے تکلف مشاہدۂ توحیدافعالی رہے یہاں تک کہ اس پر آثار مرتب ہونے لگیں،اور یہ کوئی محال بات نہیں کیونکہ خدائے تعالی کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں فرماتا اور ارشاد ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی''جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں اور مشقت اٹھاتے ہیں ان کو ہم اپنے راستے دکھا دیتے ہیں''۔ ہر چند آخر میں یہ بات پیدا ہوتی ہے مگر وہ طفیل پیر ہی کا ہے جو اس درجہ تک پہونچا دیتا ہے،الحاصل پیر''جار''ہوا اور مرید''مجرور''اوران دونوں کا تعلق فعل الہی سے ہے۔

سلطنتِ اسماء حسنٰی:

اور کبھی جار مجرور کا تعلق صیغہ ٔ صفت سے ہوتا ہے جیسے سمیعٌ،بصیرٌ ،قادرٌ وغیرہ،یہ تعلق اس طرح ہوتا ہے کہ تمام عالم میں اسمائے حسنی کی

سلطنت ہے مثلاً ''رب'' کی سلطنت اس طرح ہے کہ کوئی شئے ربوبیت الٰہیہ سے خارج نہیں ہوسکتی کما قال تعالی رب العالمین، اسی طرح ''رحمٰن'' کی عام سلطنت ہے جیسا کہ ارشاد ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی چونکہ عرش تمام عالم پر محیط ہے رحمٰن بھی محیط ہے، جہاں کسی کو نفع یا ضرر پہونچے وہاں نافع یا ضار کی سلطنت ہوگی، ہدایت اور ضلالت میں ہادی اور مضل کی سلطنت ہوگی جب تک ہادی کی سلطنت کسی پر رہے ممکن نہیں کہ کوئی اس کو گمراہ کرسکے، علی ہذا القیاس جو نافع کی سلطنت میں ہو ممکن نہیں کہ کوئی اس کو ضرر پہنچا سکے، جب پیر مرید کو صیغۂ صفت سے متعلق کرتا ہے تو بحسب تقریر بالا اس کا تعلق صفات الٰہیہ سے ہوتا ہے اور توحید صفاتی اس پر منکشف ہوتی ہے، اس طور سے کہ جس کسی میں کسی ایسی صفت کا ظہور ہو جو متعلق بذات الٰہی ہے جیسے سمیع، بصیر وغیرہ تو اس کو صفت الٰہیہ کا مظہر سمجھتا ہے غرض کہ پیر جار ہے اور مرید مجرور، یہ دونوں فعل الٰہی یا صیغۂ صفت سے یعنی اسمائے الٰہیہ سے متعلق ہوتے ہیں جس سے توحید افعالی اور توحید صفاتی نصب العین رہتی ہے۔

توحید ذاتی:

اس کے بعد توحید ذاتی ہے مگر عموماً اس سے تعلق ہونا مشکل ہے کیونکہ ذات الٰہی کو عالم سے کوئی تعلق نہیں، چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ، اور قطع نظر

اس کے اس کا ثبوت یوں ہوسکتا ہے کہ عالم کا ذرہ ذرہ خدائے تعالی کا محتاج ہے مگر اس کو دیکھنا چاہئے کہ وہ احتیاج کیسی ہے؟ پہلے پہل ہر چیز خدائے تعالی کی طرف اس وجہ سے محتاج ہے کہ اس کو وجود میں لائے، ادنی تامل سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ یہ احتیاج نفس ذات کی طرف نہیں بلکہ خالق کی طرف ہے جو اسم الٰہی ہے جس میں صفت خالقیت معتبر ہے، علی ہذا القیاس ہر شئے اپنی بقاء میں محتاج ہے سو یہ احتیاج بھی نفس ذات کی طرف نہیں بلکہ حافظ کی طرف ہے جو صیغۂ صفت سے، علی ہذا القیاس کل احتیاجیں صفات یا افعال سے متعلق ہیں اسی وجہ سے جار مجرور کا تعلق فعل سے ہوتا ہے یا شبہ فعل سے، یعنی فعل الٰہی سے یا صفات الٰہیہ سے۔

ربّ

یہ لفظ مضاف ہے، اس کا اصل ''ربب'' تھا دو حرف ایک جنس کے جمع ہوئے پہلے کو ساکن کرکے دوسرے میں ادغام کیا گیا ''رب'' ہوا یعنی پہلا باء دوسرے میں چھپ گیا، شانِ ربوبیتِ خالق کا مقتضی یہی تھا کہ خود ظاہر نہ ہو اور مربوب یعنی جس کی پرورش مقصود ہے اس کو ظاہر کر دے۔

دیکھئے جب کسی کو رزق دیا جاتا ہے تو اس کے آثار چہرہ سے نمایاں ہوتے

ہیں اور تمام قوتیں اور جسم گواہی دیتا ہے کہ روزی مل گئی ،مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس نے دی ؟ یوں تو خدا ورسولؐ کے ارشاد سے معلوم ہوگیا کہ رزق دینے والا وہی خدائے تعالی ہے مگر وجدانی طور پر یہ بات معلوم نہیں ہوتی اسی وجہ سے جب نگاہ پڑتی ہے تو اپنے ہی پر پڑتی ہے کہ ہم نے اپنے قوت بازو سے رزق حاصل کیا یا کسی غلہ سے حاصل ہوا یا کسی آدمی نے دے دیا ؟ غرضکہ خدائے تعالی نے اپنی ربوبیت کواس طرح چھپایا کہ کسی کو معلوم ہی نہ ہو،جس طرح لفظ ربّ میں پہلا ''ب'' چھپا ہوا ہے اس کی صورت محسوس ہے نہ علامت یہاں تک کہ اس کا نقطہ بھی نظر نہیں آتا اور نمایاں ہے سو وہی ایک دوسرا ''ب'' ہے،مگر لفظ رب اشارتاً کہہ رہا ہے کہ اگر بائے اول نہ ہوتا تو یہ قوت اور شدت جو مدغم فیہ میں محسوس ہے وجود ہی میں نہ آتی ہر چند پہلا ''ب'' بالکل چھپا ہوا ہے مگر جو عقلاء ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ در باطن اسی کی حرکت معنوی کا ظہور ہے،جس طرح تمام عالم کی حرکت اور قوت گواہی دے رہی ہے کہ بغیر رب العالمین کی ربوبیت کے مجال نہیں کہ کوئی حرکت کر سکے۔

لغت میں ربّ کے معنی مالک، مدبر، مربی، ولی اور نعمت دینے والے کے ہیں ،مثلاً ''رب المال'' مالک مال کو کہتے ہیں،اور فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْراً میں رب کے معنی سردار کے ہیں اور حدیث شریف میں اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّامَّۃِ میں رب کے معنی زیادہ کرنے والے اور اتمام کرنے والے کے ہیں ،اور ایک قرأت میں یہ آیت شریفہ یوں پڑھی گئی اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ

فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ یعنی قیامت کے روز روح کو حکم ہوگا کہ اپنے صاحب یعنی قالب کی طرف رضامندی کے ساتھ رجوع کر اور میرے بندہ میں داخل ہو کر میری جنت میں چلی جا، یہاں رب کے معنی صاحب کے ہیں ۔

قبیلۂ ثقیف نے ایک بڑے پتھر کا بت بنالیا تھا جس کا نام ''لات'' تھا اور اس کو الربہ بھی کہتے تھے، اسی طرح نجران میں مدحج اور بنی الحارث نے ایک گھر کعبہ کے مقابلے میں بنایا تھا اس کو وہ ''دار ربہ'' کہتے تھے یہاں رب کے معنی بڑے اور ضخیم کے ہیں، یہ گھر آنحضرت ﷺ کے حکم سے توڑا گیا۔

اور ''ربوبیت'' اور ''ربابت'' کے ایک ہی معنی ہیں یعنی پرورش، اور ربابت کے معنی مملکت کے بھی ہیں نسبت کے وقت ''ربوبی'' کہتے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے ''علم ربوبی'' اور جب مبالغہ مقصود ہوتا ہے تو الف ونون زیادہ کرکے ''ربانی'' کہتے ہیں اور ''ربانی'' عابد اور عارف باللہ شخص کو کہتے ہیں۔

انسان سے متعلق ربوبیت:

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ خدائے تعالیٰ ''رب العالمین'' ہے یعنی تمام عالموں کا پرورش کرنے والا ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ کل عوالم کتنے ہیں؟ اور ان کے پرورش کے طریقے کیسے ہیں؟ باوجودیکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آفتاب وغیرہ نجوم روزانہ اپنے کاموں

میں مشغول ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ جب تک ان کی پرورش خاص طور پر نہ ہو وہ کام نہیں کرسکتے ،مگر یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ ان کی پرورش کس طریقے سے ہوتی

ہے؟ کیونکہ پرورش کے طریقے مختلف ہیں ،چنانچہ جب ہم اپنے نزدیک کی چیزوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہر نوع کی پرورش کا طریقہ ہی جدا پاتے ہیں ،مثلاً نباتات کی پرورش صرف مٹی اور پانی سے ہے اور حیوانات کی پرورش نباتات اور پانی وغیرہ سے اور انسان کی پرورش کا طریقہ ہی جدا ہے ،چوں کہ انسان کی پرورش کا ذکر اس مقام میں آ گیا اس لئے اجمالی طور پر اس کا کچھ ذکر کیا جاتا ہے۔

یہ بات معلوم ہے کہ آدمی کی زندگی کا مدار چار خلطوں پر ہے: بلغم ،خون ،صفرا اور سوداء ،ان سب میں خون نہایت لطیف چیز ہے ،چنانچہ بعض حکیموں کے نزدیک تو خون ہی آدمی کی جان ہے ،اور اکثر کا قول ہے کہ خون سے روح حیوانی بنتی ہے ،بہرحال خون مادہ حیات ہے مگر اس میں کسی قسم کا فساد آ جاتا ہے تو وہی سم قاتل بن جاتا ہے ،عورتوں کی طبیعت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ کل خون اس کا جزء بدن نہیں ہوتا بلکہ ہر مہینے کسی قدر معمول میں خارج ہوجاتا ہے ،اگر وہ خارج نہ ہو تو اقسام کے امراض پیدا ہوتے ہیں جو باعث ہلاکت ہوتے ہیں ،اب دیکھئے کہ یہی خون جس کا دفع ہونا ضروری تھا حمل ہوتے ہی وہ جمع ہونے لگتا ہے اور غالباً بچے کے جسم کا تغذیہ اسی سے ہوتا ہے ،جب اس میں جان بھرتی ہے تو وہی خون ناف کے ذریعہ سے اس کے جسم

میں سرایت کر کے اس کا جزء بدن بنتا ہے، اگر یہی خون ماں کے اعضاء میں سرایت کرنے لگے تو نوبت بہلاکت پہونچ جائے، اور بچہ باوجودیکہ نہایت نازک اور ضعیف القوی ہے مگر اسی مادۂ سمی کو نوش جان کر کے اس زاویۂ تیرہ

وتار میں اپنے پروردگار کا شکر جان ودل سے بجالاتا ہے، اگر اس مقام میں اس کے روبرو بریانی ومزعفر رکھا جائے تو ہرگز اس کی طرف رخ نہ کرے گا بلکہ وہ اس کے حق میں سم قاتل ہے جس سے معلوم ہوا کہ بچے کی غذا ماں کے حق میں سم قاتل ہے اور ماں کی غذا بچے کے حق میں سم قاتل ہے، ایک مدت معینہ تک کھانا، پانی، دوا، غذا جو کچھ کہیئے وہی ایک شئے ہے جو اس کی ماں کے حق میں زہر ہلال سے کم نہیں، چونکہ وہ ایک ایسے مقام میں ہے کہ جہاں نہ نباتات کا وجود ہے نہ حیوانات وغیرہ کا اور نہ وہ اپنے قوت بازو سے کسب معاش کرسکتا ہے اس لئے ربوبیت الٰہی نے اس کے لئے یہ تدبیر کی کہ بغیر ہاتھ پاؤں اور منہ ہلانے کے ناف کے ذریعہ سے خود بخود اس کو غذا پہنچتی رہے جس کی نہ اس کو خبر ہے نہ اس کے ماں باپ کو، جب ہمیں یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ ربوبیت کسی خاص طریقہ کی پابند نہیں، مقام تنگ وتاریک میں جہاں انسان کی دسترس نہ ہو وہاں روزی فراہم کردے زہر سے غذا کا کام اور ناف سے منہ کا کام لے تو بڑی ہٹ دھرمی کی بات ہوگی کہ اللہ تعالی کی قدرت انہیں امور میں منحصر اور محدود کردی جائے جو عادت میں جارہی ہیں۔

یہاں ایک لطیف بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ احادیث سے ثابت ہے کہ

ہمارے نبی کریم ﷺ جب اس عالم میں تشریف فرما ہوئے تو آپ کا نال کٹا ہوا تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کی غذا ایام حمل میں وہ نہ تھی جو ہر فرد بشر کی ہوا کرتی ہے یعنی خون حیض، کیونکہ اس کے پہونچانے کا ذریعہ ہی منقطع کر دیا گیا تھا، اگر چہ اس مقام میں وہ خون نہ شرعاً نجس ہے نہ عقلاً مگر عالم تخیل میں تو اس سے کراہت

ضرور ہوتی ہے، اس لئے حق تعالی نے اپنے حبیب ﷺ کے حق میں یہ بھی گوارا نہیں فرمایا اور وقت ولادت باسعادت یہ بات سب پر منکشف کرادی گئی کہ اس عالم میں آپ کی غذا بھی کچھ اور تھی پھر اس عالم میں بھی اصلی غذا آپ کی کچھ اور ہی تھی جس کا حال خود اپنی زبان فیض ترجمان سے فرماتے ہیں کہ **ابیت عند ربی فیطعمنی ویسقینی** یعنی میں رات کو اپنے پروردگار کے یہاں رہتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے'' ظاہر بین اس طعام وشراب کی حقیقت کیا جانیں! اگر فقط لاعلمی ہو تو مضائقہ نہیں کیونکہ آدمی بہت ساری چیزوں کو نہیں جانتا جس کا سب کو اعتراف ہے، مگر قابل افسوس یہ بات ہے کہ بعض لوگ اپنی لاعلمی کو اس بات پر دلیل بناتے ہیں کہ اس کی کچھ اصل ہی نہیں، ان سے یہ پوچھا جائے کہ ہم ہی تھے کہ ایک سمی مادے کو مدتوں ہضم کرتے رہے اور اب نہیں کر سکتے، ہم میں کون سی چیز کم ہوگئی جس سے اس کے ہضم کرنے کی قوت باقی نہ رہی؟ ہمارے اصلی اعضاء جو اس وقت ضعیف تھے اب قوی ہو گئے تمام قوتوں میں کمال پیدا ہو گیا، اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ قوت ہاضمہ اچھی طرح اس کو ہضم کر سکے، میں دعوی

سے کہتا ہوں کہ اس کی کوئی ایسی وجہ نہ بتلاسکیں گے جو تشفی بخش ہو، پھر جب اس غیر معمولی غذا کو مان گئے تو دیگر غیر معمولی غذاؤں کو ماننے میں کیا نقصان ہوگا ؟۔

الغرض ایک مدت تک ربوبیت کا ظہور اس طرح ہوتا رہا جس کا حال ابھی بیان کیا گیا، اس کے بعد جب ہم اس نہاں خانۂ بطون سے جلوہ گاہ ظہور میں برآمد ہوئے تو شان ربوبیت دوسرا رنگ لائی ، وہی خون جو ہمارے اس مسکن میں ابر کی طرح ہمیں سیراب کرتا تھا اب نیچے سے اوپر کی جانب چڑھایا گیا اور ان حوضوں میں پہونچا جو مدتوں سے سوکھے پڑے تھے، وہاں اس نے ایسی صورت بدلی کہ پہلی صورت کا نام ونشاں تک باقی نہ رہا، اس کا قوام نہایت لطیف اور رنگ نہایت براق ذائقہ نہایت شیریں اور نہایت خوشگوار ہوگیا ،اور ان حوضوں میں فوارے لگادئے گئے، یہ سامان ربوبیت ہمارے یہاں آنے سے پہلے ہی کردیا گیا ،مگر اب وہ عالم کہاں جس میں بغیر مانگے اور بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے رزق خود ہمارے پاس آتا بلکہ خود بخود ہمارے جسم میں چلا جاتا تھا، اب تو ہوا ہی پلٹ گئی اور بغیر کوشش کئے اس کا ہم تک پہونچنا دشوار ہوگیا ، دیکھا کہ وہ نہ ہم تک آتا ہے نہ ہم اس تک جاسکتے ہیں اپنی بے بسی پر بے اختیار رودیا ۔ع لمؤلفہ:

زمانے تک رہا رونا عدم کے چھوٹ جانے پر

فرد ہوتا گیا پھر رنج وغم آہستہ آہستہ

ادھر شان ربوبیت نے ماں میں شفقت پیدا کردی کیسی ہی حالت میں

ہورونے کی آواز پر اس کے کان لگے ہوئے ہیں جہاں بچہ رویا بےقرار ہوکر خوان نعمت لے کر دوڑی، اب زحمت ہے تو اس قدر ہے کہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دے کر اپنی غذا حاصل کرلیں، یہ طریقہ اس زمانے تک رہا کہ ثقیل غذا کو بذریعہ آلات یعنی دانت سے پیس کر نہیں کھا سکتے تھے اس کے بعد جب دانت دیئے گئے تو اب ربوبیت کا طریقہ دوسرا مقرر کیا گیا، اور ہر قسم کی ثقیل اور کثیف غذائیں کھانے لگے، یہ تو ایک عام بات تھی، اگر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو ہر عضو کی ربوبیت اور پرورش کا طریقہ ہی علیحدہ ہے۔

دیکھئے اس ایک غذا سے جو کھائی جاتی ہے مختلف مقاموں میں مختلف چیزیں پیدا ہوتی ہیں، سب میں نہایت نرم گوشت، ہڈی نہایت سخت مثل پتھر کے، پٹھے ایسے مضبوط کہ جن کا ٹوٹنا مشکل، جس عضو کی طبیعت دیکھئے جدا، کوئی نہایت گرم ہے تو کوئی نہایت سرد، کسی کا رنگ سرخ، کسی کا سفید وسیاہ وغیرہ غرض کہ اس چھوٹے سے جسم میں اتنے کارخانے قائم ہوئے جو تمام عالم میں ہیں، اور ہر ایک کا رزق اسی ایک غذا سے حاصل ہوتا ہے اور سب اپنا اپنا رزق حاصل کر کے رب العالمین کی شکر گزاری میں مشغول رہتے ہیں، جس طرح ہمیں خبر نہیں ہوتی کہ ہر ایک کا رزق کس طرح پہونچا ان کا شکر کرنے کا حال بھی ہمیں معلوم نہیں ہوسکتا، ان کے رزق پہونچانے میں اگر ہمارے فعل کو دخل ہے تو اس قدر ہے کہ ہم اس کو اپنی قوت سے حلق کے نیچے اتار دیتے ہیں پھر نہیں معلوم کہ اس اندھیری کوٹھری میں کیا کیا ہوتا ہے؟ دراصل حلق سے نیچے پہونچانا بھی ہمارے اختیار میں نہیں وہ بھی ربوبیت ہی سے تعلق رکھتا ہے، دیکھئے اگر

ایک پٹھے میں بھی فرق آجائے تو منہ کا کھلنا دشوار ہے غرضکہ ربوبیت الٰہی کے کرشمے بے حدو بے حساب ہیں، عالم تو ایک بڑی چیز ہے صرف ہم اپنے آپ ہی کو دیکھیں تو عمر تمام ہو جائے اور اس کا علم ہنوز ناتمام رہے۔

آدمی کا ذاتی مقتضی ہے کہ جس شخص سے اپنی پرورش متعلق ہوتی ہے اس کا نہایت ممنون واحسان ہوکر سرگرمی سے اس کی خدمت واطاعت میں مشغول ہوتا ہے، دیکھئے ایک مہینے کے بعد جو شخص ماہوار دیتا ہے اس کی خدمت واطاعت روزانہ ایک مہینے تک کرنی مشکل نہیں ہوتی، ذاتی کاروبار چھوڑ کر آدمی خوشی سے اس کے کاروبار میں مشغول ہوتا ہے اور اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم اس پر کوئی احسان کر رہے ہیں بلکہ اسی کا احسان مانتے ہیں جس نے نوکر رکھا، چنانچہ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

مِنت مِنہ کہ خدمت سلطان کنی

منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

پھر اگر غور کیا جائے تو نوکری وغیرہ ملنی بھی ربوبیت ہی کا اثر ہے اس لئے کہ ابھی معلوم ہوا کہ ربوبیت ہر وقت باقتضائے حال بدلتی گئی جب وہ زمانہ آگیا کہ اپنی قوت بازو پر گھمنڈ اور لوگوں کے دینے لینے پر بھروسہ ہے تو اس وقت کا اقتضاء یہی تھا کہ خواہ اطاعت کرو یا نہ کرو اور خالقیت کا اعتراف کرو یا نہ کرو ربوبیت اور پرورش میں فرق نہیں آسکتا، کیونکہ جس مدت تک اس عالم میں رکھنا ہے اس وقت تک روزی دینے کی ضرورت ہے جس طرح سلاطین قیدیوں کو بھی روٹی دیتے ہیں، گو کیسا ہی سخت مجرم اور

باغی ہو، ہاں اتنا فرق ہے کہ سلاطین نے دارالجزاء قید خانہ کو بنایا ہے اس لئے وہ روزی دینے میں بھی سزا کا لحاظ رکھتے ہیں بعض کم مقدار اور ادنی درجہ کی غذا دیتے ہیں۔

اور حق تعالی نے چونکہ دارالمکافات اور جزاء اور سزا دوسرے عالم میں رکھے ہیں اس لئے ان کی روزی پر یہاں کچھ اثر نہیں ڈالا گیا بلکہ مجرموں کو بے جرموں سے زیادہ اور عمدہ غذائیں اور آسائشیں یہاں دی جاتی ہیں، کیونکہ اس کو رحمت گوارا نہیں کرسکتی کہ ایک جرم کی سزا اس عالم میں بھی ہو اور اس عالم میں بھی، چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے الدنیا جنة الکافرین اور حق تعالی فرماتا ہے نُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْن یعنی ہم ان کو مہلت دیتے ہیں چونکہ لوگوں کی عقلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اس لئے ان کی نظر اس پر پڑتی ہی نہیں کہ جب سے ہم ماں کے رحم میں آئے تب سے اب تک ہر آن و ہر لحظہ کیسی کیسی پرورشیاں ہوئیں! اسی وجہ سے رازق حقیقی سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور اسی کو آقا اور رازق سمجھتے ہیں جو کوئی کچھ دے دیتا ہے، بخلاف ان کے جن کی عقلیں سلیم ہوتی ہیں ان کی نظر ہر ایک موقعہ کی ربوبیت پر پڑتی ہے اور سمجھ جاتے ہیں کہ اس موقعہ میں بھی ربوبیت کا ظہور خاص طور پر ہو رہا ہے اس لئے وہ تمام وسائط میں ربوبیت الٰہی کو مدنظر رکھتے ہیں ہر وقت شکر الٰہی بجالاتے ہیں، اور چونکہ ان وسائط کی شکرگزاری کا بھی حکم ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ یعنی لوگوں کی شکرگزاری بھی ضروری ہے اس لئے محض امتثال امر کے لحاظ سے اپنے محسن کے بھی شکرگزار رہتے ہیں، اور حق تعالی فرماتا ہے وَقُلْ رَّبِّ

ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِىْ صَغِيْرًا یعنی اے میرے رب جس طرح میرے ماں باپ نے مجھے پرورش کی تو ان پر رحم کر، دیکھئے اس آیت شریفہ میں تعلیم ہے کہ ماں باپ کی ربوبیت بھی مانی جائے اور خالق کی ربوبیت بھی، کیونکہ لفظ ''ربیانی'' سے ان کی ربوبیت بھی مانی جائے اور خالق کی ربوبیت ثابت ہے، کیونکہ اصل ربوبیت خالق عزو جل کی ہے اس لئے اس کی شکر گزاری اور عبادت فرض ہے، حق تعالی فرماتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِيْنَ فِيْهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ یعنی لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر استقامت کی تو نہ ان کو کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے، وہی لوگ جنت والے ہیں جو ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ نتیجہ ان اعمال کا ہے جو وہ کرتے تھے اس سے ظاہر ہے کہ صرف خدا کو رب کہہ دینا کافی نہیں بلکہ اس پر استقامت بھی ضروری ہے، اور جب تک وہ مشاہدہ اور ایسے اعمال صادر نہ ہوں جو شکر گزاری پر دلیل ہیں استقامت صادق نہیں آسکتی، اسی وجہ سے اس آیت شریفہ میں جنت جزائے اعمال قرار دی گئی ہے جو شکر گزاری پر دال ہے، اور دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ، نَحْنُ اَوْلِيَآؤُكُمْ وَفِى الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِىْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَاتَدَّعُوْنَ، نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ، یعنی لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے ان پر فرشتے نازل

ہوں گے اور یہ کہیں گے کہ اب نہ تم ڈرو اور نہ غمگین ہو اور خوش ہو جاؤ اس جنت سے جس کا تم وعدہ دئے جاتے تھے، ہم تمہارے دوست ہیں دنیا اور آخرت میں، اب اس میں تمہارے لئے وہ چیزیں ہیں جن کی خواہش کرنے والے کی جانب سے، ان آیات شریفہ میں ان لوگوں کے مدارج بیان کئے گئے ہیں جو ''ربنا اللہ'' کہہ کر اس پر استقامت کرتے ہیں، دیکھئے کس درجہ کا تقرب حاصل ہے کہ قیامت میں جب غضب الٰہی جوش میں ہوگا اور ہر طرف سے نفسی نفسی کی صدائیں بلند ہوں گی ان حضرات کے پاس فرشتے آئیں گے اور کہیں گے کہ تمہیں آج کچھ خوف نہیں اور ہرگز غمگین نہ ہو تمہاری سب خواہشیں پوری ہوں گی اور خدا کے مہماں ہوں گے۔

یوں تو اللہ تعالیٰ کو رب کہنے والے سب مسلمان بلکہ کفار بھی ہیں مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کسی مسلمان کو قیامت میں کچھ غم اور خوف نہ ہوگا؟ ہرگز نہیں کیونکہ اس روز خوف وغم ہونا نصوص قطعیہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، صرف اہل استقامت کے حق میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وارد ہے کہ ایسے خوف وغم نہ ہونا اولیاء اللہ کا خاصہ ٹھہرا اور ربنا اللہ کہہ کر استقامت کرنے والوں کو بھی خوف وغم نہ ہوگا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرات اولیاء اللہ ہی ہیں، اس صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ ان کا ربنا اللہ کہنا معمولی طور پر نہیں بلکہ ان کو مشاہدۂ ربوبیت ہمیشہ رہتا ہے، پھر ان میں دو فریق ہیں ایک وہ کہ وسائط کی ربوبیت میں خالق کی ربوبیت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ایک وہ کہ خالق ہی کی ربوبیت ان کے پیش نظر رہتی ہے اور وسائط ان کے نظروں سے بالکل ساقط

ہوجاتے ہیں،اس کی مثال یوں سمجھنی چاہئے کہ کسی میدان میں شمع رکھی ہواور صبح صادق طلوع کرے تو ابتداء میں تو شمع کی روشنی نمایاں رہے گی مگر جوں جوں صبح کی روشنی بڑھتی جائے گی شمع کی روشنی دھیمی ہوتی جائے گی یہاں تک کہ جب آفتاب طلوع ہوجائے اس وقت شمع کی روشنی بالکل محسوس نہ ہوگی ،اسی طرح جوں جوں ربوبیت الٰہیہ کا مشاہدہ بڑھتا جاتا ہے وسائط کی ربوبیت مضمحل ہوتی جاتی ہے ،اور جب مشاہدہ کمال درجہ کو پہونچ جائے تو کسی کی ربوبیت کا خیال بھی نہ آئے گا،اور جس طرح روز میثاق الست بربکم کے جواب میں خالص ربوبیت الٰہیہ کا مشاہدہ تھا،ان حضرات کو ہر وقت وہی مشاہدہ رہتا ہے ،پھر ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہوں گے بعض سمجھتے ہوں گے کہ گو ربوبیت کے وسائط مضمحل ہیں مگر فی الواقع موجود ہیں،اور بعضوں کا یہ خیال ہوگا کہ ربوبیت کے وسائط برائے نام ہیں،جیسے ہاتھ سے کسی کو مارتے ہیں تو مار ہاتھ کی طرف منسوب کی جاتی ہے حالانکہ مارنے والا دراصل نفس ناطقہ ہے۔

بہر حال ربنا اللہ کہنے والی ایک جماعت مسلمانوں میں ایسی ہونی چاہئے کہ عملاً یہ ثابت کر دکھائے کہ ان کے نزدیک اللہ کے سوا کوئی پرورش کرنے والا ہے ہی نہیں ،چنانچہ بزرگان دین کے اقوال واحوال سے ظاہر ہے کہ نہ انہوں نے کسی سے کچھ مانگا نہ اورکوئی تدبیر کی ، بلکہ توکل پر ان کی گزاران رہی ، یہ ان کا ذاتی خیال نہیں بلکہ تعلیم الٰہی بھی اس قسم کی انہیں ہوئی ، کیونکہ مدار مدارج عالیہ کا ربنا اللہ کہنے پر رکھا گیا ہے،اہل مذاق جانتے ہیں کہ ربنا اللہ سے توحید ربوبیت مقصود ہے ورنہ اللہ ربنا ہوتا،اسی وجہ

سے رب الناس ارشاد ہوا جس سے ظاہر ہے کہ کل آدمیوں کی پرورش اسی سے متعلق ہے۔

الف (الف لام)

الف وہ حرف ہے جس کو عالم حروف یعنی حروف تہجی میں صدارت حاصل ہے جتنے حروف ہیں سوائے ہمزہ کے سب کے نام کی ابتداء میں تلفظ اسی حرف کا ہوتا ہے جس کا نام ہے، جیسے ''لام'' کہ اس کے شروع میں (لام) ہے بخلاف ''الف'' کے کہ اس کے نام کی ابتداء میں (ا) نہیں بلکہ ہمزہ ہے، جس سے ظاہر ہے کہ جس طرح تمام عالم حروف میں اسم ذات مسمی پر دلیل ہے الف میں وہ بات نہیں، جیسے اسم الٰہی پر دلیل نہیں ہے، اگر لفظ ''اللہ'' عجم میں ناواقفوں کے روبرو کہا جائے تو کسی کا خیال اس کے مسمی کی طرف منتقل نہ ہوگا، چونکہ ہمزہ نے الف کے نام سے خاص تعلق پیدا کیا اس وجہ سے اس میں بھی خاصیت پیدا ہوگئی کہ ہمزہ کا نام بھی اپنے مسمی پر دلیل نہیں۔

ذاتِ الف جب نہاں خانۂ بطون سے دارالسلطنت عالم حروف یعنی دہن میں جلوہ گر ہوتا ہے تو زبان، لب، حلق جن کو مخارج سے حروف کے نکالنے میں دخل ہے وہ کل مخارج حروف سے بے تعلق اور علحدہ ہوجاتے ہیں تاکہ کہیں کوئی حرف نکل نہ پڑے، غرضکہ جس وقت الف برآمد ہوتا ہے کل اعیان ثابتہ حروف کے زاویہ خمول میں رہتے ہیں اور الف ان سب کے مقامات پر مسلط ہوتا ہے اس وقت جدھر دیکھئے الف ہی

الف ہے۔

اہل اعتبار سمجھ سکتے ہیں کہ الف کو جو اس قدر تسلط حاصل ہے وہ بدولت سکون ہے، اسی وجہ سے جو خاص بندگان الٰہی ہیں وہ اپنے خالق کے روبرو ایسے بے حس و حرکت ہوتے ہیں کہ کسی بات میں دم نہیں مارتے، نہ ان کو اپنے نفع سے غرض ہوتی ہے نہ نقصان سے کام، وہ ایسے ہوجاتے ہیں جیسے میت غسال کے ہاتھ میں، حضرت غوث الثقلین ؓ فرماتے ہیں کہ **کن کالمیت في ید الغسال**، جب سکون اس کا اس حد تک پہونچ جاتا ہے تو ان کو عالم میں تصرف دیا جاتا ہے۔

الف مکتوبی کو باوجود اس کے کہ عالم حروف میں صدارت حاصل ہے مگر اس کو کسی کے ساتھ پیوستگی نہیں دیکھئے وہ کسی کے ساتھ نہیں ملتا، یہ بات اور ہے کہ کوئی اوپر سے آکر اس کے ساتھ مل جائے مگر وہ اپنی طرف سے کسی سے نہ ملے گا، یہی حالت اہل تجرد کی ہوتی ہے کہ ان کو اپنی ذات سے کسی کے ساتھ دل بستگی نہیں ہوتی، اگر بامر الٰہی کسی کو ان کے ساتھ تعلق ہوجائے تو وہ اس کو گوارا کرلیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ للّٰہی تعلق اور محبت اہل اللہ کے ساتھ ان کو ہوتی ہے، اہل تجرد کو الف کے ساتھ نہایت خصوصیت ہوتی ہے، چنانچہ کسی بزرگ نے فرمایا ہے:

نیست برلوحِ دلم جز الف قامتِ یار

چہ کنم حرفِ دگر یاد نداد اوستادم

الف مکتوبی کو ایک اور خصوصیت اور فضیلت حاصل ہے کہ جس طرح عالم

حروف میں اس کوصدارت حاصل ہے عالم اعداد میں بھی اسی کوصدارت حاصل ہے ،اس کا مدلول جوایک ہے ہر چند عالم اعداد کی ابتداء اسی سے ہے مگر سلسلۂ اعداد میں وہ شریک نہیں، کیونکہ عدد بنانا اس کا کام ہے،اور ظاہر ہے کہ جو چیز بنائی جائے بنانے والا اس سے خارج ہوگا۔

دیکھئے ایک (ا) جب تک اپنی وحدت ذاتی پر ہے اس میں کسی قسم کا تعدد نہیں پھر جب اس ایک کے ساتھ دوسرا ایک ملا دو (۲) ہوئے ،اس دو کے بنانے والا وہی ایک ہے جوایک پر زیادہ ہونے سے دو بن گئے، پھر دو پر وہی ایک زیادہ ہوا تین (۳) ہوگئے ،اس تین کو بھی اسی ایک نے بنایا،علی ہذاالقیاس ہر عدد کے وجود میں ایک کو دخل ہے کیونکہ اگر ایک اس سے ہٹ جائے تو وہ فنا ہوجائے گا، یہ امر مسلم ہے کہ عالم اعداد ایک ایسا عالم ہے کہ اس کی انتہاء ہی نہیں کیونکہ عدد کا سلسلہ غیر متناہی ہے اور ہر ایک عدد اپنے تشخص وذات میں مستقل اور دوسرے سے ممتاز ہے،اگر کوئی چار کو پانچ کہے تو دیوانہ سمجھا جائے گا ،اس سے ظاہر ہے کہ عالم اعداد میں غیر متناہی اشخاص ہیں اور وہ ''ایک'' سب کے ساتھ ہے مگر کسی کا عین نہیں بلکہ سب کو وجود دینے والا ہے،اب اس ''ایک'' کے تجرد کو دیکھئے کہ باوجود سب کے ساتھ ہونے کے کوئی عدد یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک میں ہوں، پھر لطف خاص یہ ہے یہ جدھر دیکھئے ایک ہی ایک ہے اور اسی کا ظہور ہے ۔

دوعددوں کو جو آپس میں ضرب دیا جاتا ہے جس سے کثرت پیدا ہوتی ہے اس

میں بھی یہی راز ہے کہ ''ایک'' جتنے منازل ومراتب طے کرتا ہے ان کا مجموعہ حاصل ضرب ہوتا ہے، مثلاً ۴ کو ۵ میں ضرب دیں تو ۴ مضروب اور ۵ مضروب فیہ ہوں گے، اگر اصلی شکل پر لکھیں تو یوں لکھے جائیں گے IIIIxIIIII IIIIIxIIII اوران کو ضرب دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان چاروں میں سے ایک ایک کو ان پانچوں پر لگائیں گے، اس طرح کہ پہلا ایک ان پانچوں پر لگایا جائے گا تو ۵ حاصل ہوں گے جو اس کے ہر ایک کے ساتھ متعلق ہونے کی گنتی ہے، اسی طرح جب دوسرا لگایا جائے گا تو اور ۵ حاصل ہوں گے، یہاں تک کہ چاروں ظاہراً چاروں میں سے ہر ایک پانچ کے مجموعہ میں چلا اور پانچ منازل طے کئے مگر جب غور سے دیکھا جائے تو چاروں میں ہر ایک کی حقیقت ایک ہی ہے اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک نے بیس منازل طے کئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار جو ایک مرتبہ عددی ہے بحیثیت مجموعی مضروب نہیں بلکہ مضروب اس میں سے ایک ہی ایک ہے، کیونکہ ضرب کرنے سے مقصود یہ نہیں کہ چار کو پانچ پر ماریں تو وہ ٹوٹ کر ان کے بیس ٹکڑے ہوں گے بلکہ مثال مذکور میں ۴x۵ چار کی ہر ایک اکائی کو پانچ کی ہر ایک اکائی کے ساتھ ملایا جائے یعنی ضرب دیا جائے تو ہر ایک اکائی کے ضرب میں کچھ بھی نہ بڑھا، کیونکہ ایک کو ایک میں ضرب دینے سے ایک ہی حاصل ہوتا ہے، مگر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پانچ اکائیاں حاصل ہوئیں، علیٰ ہذا القیاس چار بار ضرب دینے سے بیس اکائیاں حاصل ہوں گی اور بیس کی ہیئت مجموعی پیدا ہوگی، اب غور کیجئے کہ عالم عدد میں کثرت کو دیکھئے تو کچھ انتہاء ہی نہیں اور وحدت کو دیکھئے تو ہر طرف ایک ہی ایک ہے

کہیں اس کے ذاتی تشخص میں فرق نہیں۔

جو لوگ بالغ النظر ہیں ان کی نظر عالم میں بھی اسی ایک پر جا پڑتی ہے جو تمام عالم اور ہر شئے کو بنانے والا ہے اسی کی بدولت ان کو تقرب الٰہی حاصل ہوتا ہے، کیوں نہ ہو جب ہمیشہ ان کو کثرت عالم میں خیال اسی ذات وحدہ لاشریک لہ کا ہو تو اس سے زیادہ اور کیا تقرب ہوسکتا ہے؟ وہ ہر چیز کو دیکھتے ہیں مگر التفات اور توجہ ان کی صرف اسی ذات پاک کی طرف ہوتی ہے جیسا کہ اس مثال سے واضح ہے کوئی عمدہ کسی فن کی خوشخط کتاب کسی مجلس میں پیش ہو جہاں عالم، خوشنویس، تاجر وغیرہ موجود ہوں اس کو سب دیکھیں گے مگر ہر ایک کی نظر جدا ہوگی، مثلاً عالم ماہر فن کی نظر اس کتاب کے مضمون کی طرف ہوگی، اور خوشنویس کی نظر خط پر، اور تاجر کی نظر قیمت پر، حالانکہ ایک ہی چیز کو متعدد لوگ دیکھ رہے ہیں مگر ہر ایک کی نظر جس امر پر ہے دوسرا اس سے غافل ہے، اگر ماہر فن سے پوچھا جائے کہ اس کے خط میں کوئی سقم تھا یا اعلیٰ درجے کا باقاعدہ تھا؟ تو کچھ بتا نہ سکے گا، اسی طرح خوشنویس سے پوچھا جائے کہ اس کتاب کا کیا مضمون تھا؟ تو کچھ نہ بتا سکے گا، اسی طرح اہل اللہ کی نظر ہر چیز میں علی حسب مراتب خدائے تعالیٰ کی صنعت اور صفات وغیرہ پر پڑتی ہے جس سے وہ ہمیشہ مشاہدہ صفات الٰہی میں مستغرق رہتے ہیں

۔

الحاصل اعداد کے سلسلہ میں ہر ایک درجہ عدد کا ممتاز ہے، مثلاً دو (۲) بہ نسبت تین (۳) کے ممتاز ہے کوئی دو کو تین نہیں کہہ سکتا، اور لوازم بھی ہر ایک درجے کے

جداگانہ ہیں، مثلاً دوزوج ہے اور تین فرد ہے اور مربع دومربع کا چار ہوگا اور تین کا نو ہوگا، اسی طرح جذرومجذور وغیرہ میں بحسب تعین خاص امتیاز ہوگا، جس سے ظاہر ہے کہ کوئی عدد دوسرے کا عین نہیں باوجودیکہ مرتبہ میں ظہور اسی ایک کا ہے، گویا جتنے مراتب ہیں اسی ایک کے تعینات خاصہ ہیں، جیسے وجود مطلق ایک ہے اور وجودات خاصہ جو مطلق کے تعینات ہیں اگران کے خاص خاص تعینات سے قطع نظر کرلیا جائے تو وہی وجود مطلق رہ جائے گا، کیونکہ مقید مطلق کا مظہر ہوتا ہے اور مقید کا ایک عین ثابت ہوتا ہے جس کو وجودنہیں کہہ سکتے، اسی طرح ہر عدد کا ایک عین ثابت بھی ہوگا جس کو عددنہیں کہہ سکتے۔

بالغ النظر ۲ کو دواکائیاں سمجھے گا اور ہر ایک معدود کو مستقل ایک کہے گا، اور یہ خیال نہ کرے گا کہ (۲) مستقل عدد ہے تو ہر ایک ایک کا آدھا ہے، بلکہ یہ خیال کرے گا کہ محسوس ایک ایک ہے اور اس کو دو کہنا اعتباری ہے، علی ہذا القیاس کل مراتب اعداد کا یہی حال سمجھا جائے گا۔

اب دیکھئے غیر متناہی سلسلہ میں جدھر دیکھئے حقیقتاً ایک ہی ایک ہے اور جتنے اعداد ہیں سب اعتباری ہیں، الف (ا) کو عالم حروف میں جو صدارت ہے وہاں وہ کسی سے نہیں ملتا کیونکہ وہ عالم اشکال ہے، اور عالم اعداد میں بھی صدارت اسی کو ہے، مگر سب کے ساتھ اسے الفت ہے کیونکہ وہ کل اعداد کا بنانے والا ہے، اور ظاہر ہے کہ بنانے والے کو اپنے مصنوعات سے الفت ہوا کرتی ہے۔

کوئی چیز فی نفسہ بری نہیں:

دیکھئے عالم کی ہر چیز خواہ اچھی ہو یا بری اس کے ساتھ جب تک مشیت، ارادہ اور قدرت متعلق نہ ہو وجود میں نہیں آسکتی، اس درجہ میں کسی چیز کو بری نہیں کہہ سکتے کیونکہ جس طرح صفات موصوفہ اچھی چیز کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں بری کے ساتھ بھی متعلق ہوتے ہیں، اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ، الحاصل نفس تخلیق میں برائی کا کوئی شائبہ نہیں بلکہ حسن وقبح اضافی امور ہیں ایک ہی چیز کسی کے حق میں اس کے اعتبار سے اچھی ہوتی ہے تو کسی اور کے حق میں بری۔

اہل تناسخ جو کہتے ہیں کہ آدمی اچھے کام کرے تو اس کی روح برہمن اور گائے کے جسم میں جائے گی اور برے کام کرے تو برے جانوروں کے جسد میں، یہاں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اچھا یا برا کس اعتبار سے کہا جائے، اگر کتے کو برا کہیں تو وہ ہمارے حق میں برا ہے "کتے" اس کو برا نہیں سمجھتے، علی ہذاالقیاس جس جانور کو دیکھئے وہ اپنی حالت میں مست ہے کبھی اس کو خیال بھی نہ آتا ہوگا کہ آدمی یا دوسرا کوئی جانور بن جاؤں، دیکھئے جانور آدمی کے نزدیک آنا بھی گوارا نہیں کرتے جب تک ان کو بہلایا یا پھسلایا اور چمکارا نہ جائے یا ان کی خوشامد نہ کی جائے اور ان کی تمام حوائج پوری نہ کی جائیں، پھر برہمن جو بحسب اصول تناسخ "ترقی یافتہ جانور" ہیں ان کو خبر بھی نہیں کہ قبل ازیں وہ کس قسم کے

جانور تھے؟!

جواب اہل تناسخ:

بہت سے برہمن اپنے سے کم درجہ لوگوں کے پاس بطور باورچیوں کے نوکر ہوئے ہیں اور حالت افلاس میں رہتے ہیں، وہ اپنے دل میں ضرور کہتے ہوں گے کہ ایسی ترقی سے تو جانور ہی رہنا بھلا تھا نہ نوکری کی فکر ہوتی نہ جورو بچوں کو پالنے کی مصیبت، اس سے ظاہر ہے کہ حکماء نے تناسخ کی بنیاد جس غرض سے ڈالی تھی کہ لوگ برے کاموں سے احتراز کریں اس خیال سے کہ اگر برے کام کریں گے تو برے جنم لیں گے، وہ اس قابل نہیں کہ کوئی عقلمند اس کا قائل ہوسکے۔

غرضکہ موجود ہونے کے اعتبار سے کوئی چیز بری نہیں ہوسکتی کیونکہ شر محض عدم ہے اور نفس وجود خیر محض ہے، البتہ صفات وحالات کے اعتبار سے برائی آتی ہے مگر وہ بھی عام نہیں ہوتی بلکہ بعض کی نسبت وہ چیز بری ہوتی ہے اور بعض کی نسبت اچھی، مثلاً نجاست انسان حلوائے بے دودھ کو کھاتا ہے، ایک ہی چیز کسی کے حق میں زہر ہے اور کسی کے حق میں تریاق اس سے معلوم ہوا کہ کوئی موجود چیز شر محض اور ہر طرح سے بری نہیں ہوسکتی ورنہ خالق عزوجل اسے پیدا ہی نہ فرماتا۔

غرضکہ ایک (ا) جو اعداد بنانے والا ہے جس طرح اس کو کل اعداد کے ساتھ

الفت ومعیت ہے اسی طرح خالق عالم کو اپنی مصنوعات کے ساتھ بحیثیت خالقیت محبت اور تعلق خاص اور معیت ہے، اسی وجہ سے ربوبیت الٰہی عام ہے خواہ مومن ہو یا کافر سب کو رزق دیتا ہے۔

گزشتہ صفحات کی تقریر میں معلوم ہوا تھا کہ الف (ا) بالذات تمام عالم حروف پر محیط ہے اور اس عالم کا کوئی فرد ایسا نہیں جس کو اس اعتبار سے تعلق خاص اس کے ساتھ نہ ہو، مگر اس کو لام (ل) سے جو خصوصیت ہے وہ کسی کو نہیں، کیونکہ اس کے دل میں الف ہے جس طرح الف کے دل میں لام ہے، اس خصوصیت کے لحاظ سے جب الف ولام ملتے ہیں تو اقسام کے لطائف وظرائف پیدا ہوتے ہیں، مثلاً ''لا'' میں لام باوجودیکہ مقدم ہے مگر کتابت میں الف ہی مقدم ہے اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو کہ گویا لام نے کمال محبت سے الف کی عظمت کو پیش نظر رکھ کر اپنی صدارت اس کو دیدی اور یہ مقتضی دلی محبت کا ہے، بخلاف اس کے آج کل دیکھا جاتا ہے کہ دوستوں میں کیسی ہی خصوصیت باہمی ہو مگر جب بھی کوئی بات خلاف مرضی ہوئی کہ لام کاف بکنے لگے، الف لام کی اس ترکیب سے گویا ایک مقراض تیار ہوئی جس سے اہل ایمان ماسوی اللہ کے تعلقات کو قطع کردیتے ہیں اور لا الٰہ الا اللہ میں ایسے مستغرق ہوجاتے ہیں کہ ماسوی اللہ کی بالکل نفی ہوجاتی ہے۔ ع لمؤلفہ

اگر خواہی پیوند با کبریا
بمقراض ''لا'' قطع کن ماسوٰی

الف ، لام کے ساتھ جب ملتا ہے تو ان دونوں کے ملنے سے عجیب عجیب حالات پیدا ہوتے ہیں ، کبھی تو اسم جنس پر داخل ہو کر اس کو ایک معنی شخص بنادیتے ہیں ، کبھی افراد واشخاص سے کوئی تعلق نہیں صرف جنس یا ماہیت کے معنی میں اس کو خاص کردیتے ہیں ، اور کبھی تمام افراد کے معنی اس میں پیدا کردیتے ہیں ، جیسا کہ علم معانی میں مصرح ہے ، ان کی یہ قوت تصرف زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ جب دو شخصوں میں اتحاد قلبی ہو تو وہ بہت کچھ تصرفات کرسکتے ہیں :

دودل یک شوند بشکنند کوہ را
پراگندگی آرد انبوہ را

دیکھئے مسلمانوں کی جب تک یہ حالت تھی کہ ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ قلبی محبت تھی ان کا بڑھتا قدم کبھی پیچھے نہ ہٹا ، اور جب سے یہ صفت جاتی رہی پیچھے ہٹتا قدم آگے نہ بڑھا ۔

غرض کہ الف لام کے اتحاد قلبی سے اگر کوئی سبق حاصل کرے تو فلاح دارین حاصل کرسکتا ہے ، لام کو الف کے ساتھ جو اتحاد قلبی ہے اس کا یہ اثر ہوا کہ باوجود یکہ حروف تہجی میں لام الف سے بہت دور واقع ہے لیکن اس کی محبت قلبی نے الف کے ساتھ اس کو ملادیا اور ان دونوں سے وہ کارنمایاں وقوع میں آئے کہ تمام حروف تہجی اگر ملیں تو بھی اس قسم کا ایک کام نہیں کرسکتے ۔

اسی پر قیاس کیجئے کہ جس بندہ کے دل میں اللہ اور رسول ﷺ کی کامل محبت قلبی ہو اور ہمیشہ اس کا خیال ان سے وابستہ رہے تو اس کے فیوض و برکات اعلیٰ درجے کے ہوں گے، اسی وجہ سے جب بندہ ترقی کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس سے وہ کام لیتا ہے جو خاصۂ جناب کبریا ہے یعنی خوارق عادات اس سے صادر ہونے لگتے ہیں۔

ناس

ناس جمع ہے اور اس کا واحد ''انسان'' ہے، انسان کی اصل ''انسیان'' بروزن اِفْعِلَان تھی، اور بعض کے نزدیک فِعْلِیَان ہے، چونکہ اصل میں ''ی'' تھی اسی وجہ سے انسان کی تصغیر بالاتفاق ''انیسان'' ہے، عرب اسم کی تصغیر کیا کرتے ہیں جس کے معنی چھوٹے کے ہوتے ہیں، مثلاً ''رجل'' کی تصغیر ''رُجَیْلٌ'' ہے جس کے معنی چھوٹے مرد کے ہیں، یہ قاعدہ صَرف میں مسلم ہے کہ تصغیر کے وقت محذوفہ حروف اصلی لوٹ آتے ہیں چنانچہ اَرْضٌ کی تصغیر اُرَیْضَۃٌ ہے جس میں تائے محذوفہ تصغیر کے وقت لایا گیا، یہاں یہ بات خیال میں آتی ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی تصغیر یا تحقیر کرے تو اس کی دل شکنی ہوتی ہے، اس لئے اس کے صلہ میں یہ فیضان ہوتا ہے کہ اس کے نقص کو دفع کر کے اس کی تکمیل کی جاتی ہے جس طرح تصغیر کے وقت کلمہ کی تکمیل ہوتی ہے۔

دیکھئے انسان اصل میں ''انسیان'' تھا جب کثرت سے لوگ اس کا ذکر کرنے

لگے اور شہرۂ آفاق ہوا تو اس میں یہ تعلّی پیدا ہوئی کہ ہم بھی ایسے ہیں کہ ہر طرف ہمارے چرچے ہوتے رہتے ہیں بس یہی اس کے نقص کا باعث ہوا، یعنی کثرت استعمال کی وجہ سے ایک جزو یعنی (ی) دور کر کے ''انسان'' بنادیا گیا، پھر جب اس کی تصغیر وتحقیر ہوئی اور تکبر ٹوٹا تو اس کی تکمیل کر دی گئی اور جو نقص تکبر کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اس تصغیر کی وجہ سے دور ہو گیا، اسی وجہ سے اولیا اللہ جس قدر اپنی ذاتی ہواس سے خوش ہوتے ہیں۔

چنانچہ حضرت ابرہیمؒ کے حال میں لکھا ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ: ایک بار میرا گزر کسی مجمع پر ہوا، چند اوباش وہاں دل لگی کر رہے تھے مجھے دیکھتے ہی ایک شخص ان میں سے میری داڑھی پکڑ کر ادھر ادھر گھمانے لگا، چونکہ مجھ پر اس وقت فاقہ کی حالت تھی جب وہ داڑھی کو جھٹکا دیتا تو میں گر جاتا پھر وہ مجھے اٹھاتا اور اس پر تمام مجمع کے لوگ قہقہے لگاتے آپ فرماتے ہیں: جیسی مجھ پر اس تحقیر وتذلیل سے خوشی ہوئی کبھی نہیں ہوئی تھی ،اصل وجہ اس کی یہی ہے کہ آدمی کے نفس میں ایک قسم کا عجب وتکبر ہوتا ہے اس کو اپنی تحقیر وتذلیل ہرگز گوارا نہیں ہوتی ، جب ان حضرات کی تحقیر ہوتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اب نفس کا کفر ٹوٹا اور یہی ان کی تکمیل کا باعث ہوتا ہے، اور حدیث شریف میں جو وارد ہے کہ حق تعالی فرماتا ہے **انا عند منکسرۃ القلوب** یہ بھی اس کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ تصغیر وتحقیر میں ضرور انکسار قلب ہوتا ہے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ انسان کو ''انسان'' اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس نے روز اَلَسْــتُ جو عہد کیا تھا وہ بھول گیا، اس صورت میں اس کا مادہ ''نسی'' ہوگا اور انسیان

اصل بروزن افعلان ہوا۔

اورانسان کے معنی تیزی کے بھی ہیں چنانچہ ''انسان السیف ' ' یعنی تیزی شمشیراور''انسان السھم ''بمعنی تیزیِ تیر ہے،چونکہ بعض انسانوں میں بھی تیزی بلا کی ہوتی ہے اس لئے انسان نام رکھا گیا،اورقرآن شریف میں ہے وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلاً یعنی انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

اورانسان''اُنس'' سے بھی ماخوذ ہوسکتا ہے،اس صورت میں انسان بروزن فعلان ہوگا،چونکہ انسان میں صفت اُنس بھی ہوتی ہے جواعلی درجے کی صفت ہے اس لئے اس کا یہ لقب ٹھہرا۔

غرضکہ انسان مذاق معقولیت پراگرچہ نوع ہے مگر درحقیقت ان صفات کے لحاظ سے ان میں متعدد انواع ہیں،اس لحاظ سے یہ لفظ کلی متواطی نہ ہونا چاہیے بلکہ مشترک ہونا چاہیے،کیونکہ ہرایک کی حقیقت جدا ہے،حق تعالی ہمیں وہ انسان بنائے جس کو اپنے مالک حقیقی کے ساتھ انس ہو ۔

وماتوفیقی الا باللہ

ملک

مَلِک بادشاہ کو کہتے ہیں جس کا تصرف اورحکم نافذ ہو اورلوگ اپنے امن

وآسائش میں اس کے محتاج ہوں ، ہر چند ''مَلِک''اور''مالِک'' دونوں کا اشتقاق مِیم، لَام، کاف سے ہے، مگر مَلِک مُلک والے یعنی بادشاہ کو کہیں گے اور مالک مِلک والے کو، مَلِک میں جو خصوصیات ہیں وہ مالِک میں نہیں، کیونکہ مَلِک کی اضافت صرف عقلاء کی طرف ہوتی ہے اور مالک کی اضافت غیر ذوی العقول کی طرف بھی چنانچہ مالک الدواب یعنی جانوروں کا مالک کہتے ہیں اور مَلِک الدواب نہیں کہتے ، بلکہ مَلِک الناس کہیں گے۔

نفس ناطقہ کی سلطنت:

حق تعالٰی کو منظور تھا کہ اس صفت کا اظہار فرمائے اس لئے تمدن کی بنیاد ڈالی گئی جس سے ہر ملک کے لئے ایک بادشاہ کی ضرورت ہوئی چونکہ ہر فرد بشر میں بھی ایک مستقل سلطنت قائم ہے اس لئے اس سلطنت کا بھی ایک بادشاہ مقرر فرمایا جس کا نام ''نفس ناطقہ'' ہے اور اس کے لئے دو وزیر مقرر کئے ایک وزیر خارجیہ دوسرا وزیر داخلیہ، وزیر خارجیہ عقل ہے جس کا مقامِ اجلاس دماغ ہے۔

حس مشترک جس کو یونانی میں ''نبطا یسا'' یعنی لوح نفس کہتے ہیں گویا یہ بارگاہ سلطانی ہے یہاں دول خارجیہ کے اخبار و کیفیات پیش ہوا کرتی ہیں، دول خارجیہ سے مراد دوسرے اشخاص واشیاء ہیں کیونکہ ہر فرد انسان وغیرہ میں ایک خاص سلطنت ہے

جس کا حال بیان کیا جاتا ہے:

''باصرہ'' کا کام ہے کہ دول خارجیہ کے نقشے اور فوٹو پیش کر دیا کرے تا کہ سلطنت کو صدمہ پہونچانے والی چیزوں سے حفاظت اور مفید چیزوں کے حاصل کرنے کی فکر کی جائے ، دیکھئے جب بصارت عرض کرتی ہے کہ کوئی درندہ یا گزندہ وغیرہ حملہ کرنے کو ہے تو اس سے حفاظت کا سامان کیا جاتا ہے اور مفید سلطنت کوئی چیز ہو مثلاً عمدہ غذا وغیرہ کے متعلق عرض کر دے تو اس کو سلطنت میں پہونچانے کی تدبیر کی جاتی ہے یہ گویا عرض بیگی یا ایڈی کانگ ہے۔

ڈاکخانے کی خدمت ''سامعہ'' سے متعلق ہے جو دور دور کی خبریں پیش کرتا رہتا ہے ، مثلاً فلاں مقام میں طاعون وغیرہ امراض ہیں جو مضر سلطنت ہیں اور فلاں مقام میں مفید سلطنت چیزیں ملتی ہیں۔

حس مشترک میں باصرہ جتنے فوٹو پیش کرتا ہے ان سب کا محافظِ دفتر خیال ہے جس کو ''مصورہ'' کہتے ہیں ، یہ اس غرض سے محفوظ رکھے جاتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً ان سے ضرورتیں متعلق ہوتی رہتی ہیں اگر یہ دفتر درہم برہم ہوجائے تو ریاست میں اندھیر ہوجائے۔

سرحدی واقعہ نگار ''لامسہ'' ہے اس لئے کہ آدمی کا پوست سرحدِ کالبد انسانی ہے اور اس میں قوتِ لامسہ رکھی گئی ہے ، جب اس سرحد میں کوئی نیا واقعہ پیش آیا مثلاً کانٹا چبھ گیا یا کسی گزندے نے کاٹا فوراً بذریعۂ تار برقی بارگاہِ حس مشترک میں اس نے خبر کردی

۔

پولٹیکل امور ''واھمہ'' سے متعلق ہیں اس کا کام یہ ہے کہ باصرہ جن صورتوں کو پیش کرتا ہے ان میں وہ غور وفکر کر کے معانی پیدا کرتا ہے، مثلاً یہ کہ شیر اور گھوڑے میں معنوی فرق کس قسم کا ہے؟ چنانچہ شیر سے عداوت اور ضرر رسانی کے معنی نکالنا ہے اور گھوڑے سے نفع رسانی کے، اس کی کارگزاری کی مسلیں جو تیار ہوتی ہیں اس کی محافظت ''حافظہ'' کرتا ہے جس کا نام ''متذکرہ'' بھی ہے جب کبھی باصرہ مکرر کوئی صورت پیش کرتا ہے جس کی ضرر رسانی اور عداوت مثلاً وہم نے تشخیص کی تھی ''متخیلہ'' اس کا پہلا فوٹو جو خیال میں رکھا تھا نکالتا ہے، اس وقت حافظہ نے اس صورت سے اگر عداوت کے معنی استخراج کئے تھے تو وہ پیش کر دیتا ہے جس سے عقل حکم کرتی ہے کہ اس شخص سے حفاظت کی جائے ، اور اگر دوستی کا مضمون حافظہ نے پیش کیا تو مجلسِ وزارت سے اس کے ساتھ ملنے اور محبت رکھنے کا حکم نافذ ہوتا ہے۔

انتظام کلی ''متخیلہ'' سے متعلق ہے جس کو ''متفکرہ'' بھی کہتے ہیں، وہ امور متعلقہ کو ترتیب دے کر نتیجہ نکالتا ہے، مثلاً جب کسی زہریلے جانور کی صورت باصرہ پیش کرے اور واہمہ اس کا موذی ہونا ثابت کر دے تو متخیلہ یہ رائے پیش کرتا ہے کہ یہ موذی ہے اور جو موذی ہو اس کو مارنا چاہئے ، چونکہ مقاصد مختلف ہوتے ہیں اس لئے کبھی متخیلہ کو خزانۂ خیال کی صورتوں میں گھٹانے بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً سانپ کی صورت کی تفصیل کر کے فقط اس کا دانت لے لیتا ہے اور یہ حکم لگا دیتا ہے کہ

وہی مہلک ہے اور مہلک دور کر دیا جائے تو پھر اس سے ضرر رسانی کا اندیشہ نہیں ،اور زیادتی کی مثال یہ ہے جیسے کہ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

گربۂ مسکین اگر پرداشتے

تخم کنجشک از جہاں برداشتے

یہاں بلی کو صورت میں پر لگا دئے اور پردار بلی بنائی گئی ،اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باصرہ کسی کا فوٹو پیش کرتا ہے اور وہم اس کی حرکات وسکنات سے محبت کے معنی استخراج کرتا ہے اس وقت متخیلہ اس فکر میں ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کبھی ملاقات ہوئی تھی یا نہیں؟ چنانچہ خیال میں جو صورتیں جمع ہیں ان میں تلاش کرتا ہے کہ اس وقت اس کے افعال کس قسم کے تھے؟ کیونکہ افعال کا خزانہ بھی حافظہ ہی ہے اگر حافظہ نے ان کو تلف نہ کر دیا ہو تو وہ پیش نظر ہو جاتے ہیں،اور اگر اسی صورت سے وہم نے محبت کے معنی نکالے تھے تو فی الجملہ متخیلہ کو اطمینان ہوتا ہے ورنہ اس سے احتیاط کرنے کی ضرورت بتلاتا ہے چنانچہ کسی کا شعر ہے:

برتواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہیست

پائے بوسِ سیل از پا افگند دیوار را

باصرہ وغیرہ کی خبر رسانی کے بعد متخیلہ کی تحقیق میں جب یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی موذی سلطنت کو ضرر پہنچانے پر آمادہ ہے تو اس وقت محکمۂ دفاع وحرب پر جس کا افسر قوت غضبیہ ہے حکم جاری کرتا ہے کہ انتظام کیا جائے وہ شجاعت کو جو خاص دشمن کی

سرکوبی کے لئے مقرر ہے حکم دیتا ہے، وہ پہلے تخویف کی غرض سے آنکھوں اور چہرہ کو ہیبت ناک اور آواز کو دہشت انگیز بنا کر اس کے مقابلے میں پیش کرتا ہے، اور ارادے اور قدرت کو حکم دیتا ہے کہ فوراً قوائے محرکہ کو حکم دیں کہ اوتار و عضلات وغیرہ کو اعضاء پر مسلط کر کے دشمن پر ان کا حملہ کرادیں چنانچہ وہ مقابلہ کر کے دشمن پر فتح پاتے ہیں اور کبھی جبن جس سے صیغۂ مصالح اندیشی اور بقائے امن متعلق ہے یہ رائے پیش کرتا ہے کہ اس وقت بھاگ جانا مناسب ہے، اور بمجرد منظوری جس طریقے سے غصہ فوج کو دشمن کے مقابلے میں لایا تھا اسی طریقے سے بھاگنے کا کام اس سے لیتا ہے۔

یہ چند امور جو بیان کئے گئے وہ وزارت خارجیہ سے متعلق تھے ان کے سوا اور بہت سے کام اس صیغے سے متعلق ہیں۔

اب وزارت داخلیہ کا بھی تھوڑا سا حال سماعت فرمالیجئے: نفس ناطقہ کا دوسرا وزیر ''قوت شہویہ'' ہے جس سے اس سلطنت کے اندرونی کام متعلق ہیں، اس سلطنت بہت سے اضلاع اور تعلقات ہیں مثلاً معدہ، جگر، دل، دماغ، گوشت، پوست، عضلات، گردے، ہڈی اور جھلیاں وغیرہ، ہر ایک کی طبیعت خاص قسم کی ہے اور وہاں کا وہی مقامی افسر اور تعلقدار ہے، کسی ضلع میں کوئی مخالفت پیدا ہوجائے تو وہ وہاں سے اس کو دفع کر دیتا ہے، مثلاً معدے میں کوئی ایسی چیز آجائے جو مضر ہو تو مقامی افسر یعنی طبیعت فوراً قے یا اسہال کے ذریعہ سے اس کو نکال دیتی ہے صیغہ کوتوالی بھی اسی سے متعلق ہے، اور جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ شہوت یعنی خواہش کے روبرو پیش کرتی ہے اور وہ اس کا انتظام

کردیتی ہے، مثلاً پانی کی ضرورت ہوتو اس کی خواہش یعنی پیاس نفس ناطقہ کے حکم سے پانی وہاں پہونچادیتی ہے، علی ہذاالقیاس غذااورمقویات اورادویہ وغیرہ حسب ضرورت ہرمقام میں پہونچاتی رہتی ہیں۔

اس سلطنت میں بہت سے محکمے قائم ہیں جن میں سے چند یہاں لکھے جاتے ہیں:

محکمہ تفتیش: اس کا کام یہ ہے کہ کسی مفسد کو اندر قدم نہ رکھنے دے اس کے افسر ذائقہ اورشامہ ہیں، یہ جانچ پڑتال کرکے ان ہی کو اجازت دیتے ہیں جو سلطنت کے حق میں مفید ہوں، صیغۂ طبابت بھی ان ہی سے متعلق ہے کہ مفیداشیاء کو اندر روانہ کریں، لیکن قوت عاقلہ کا حکم ہوتو اپنے خلاف مرضی اشیاء مثلاً دوائے تلخ اورکریہہ کو بھی جانے دیتے ہیں۔

محکمۂ افزائش وتوفیر: نامیہ سے متعلق ہے جو ضرورت سے زیادہ غذا فراہم کرتا ہے۔

محکمہ فراہمی اشیاء مایحتاج: جاذبہ سے متعلق ہے جس طرح ایام قحط میں ایک سلطنت عہدہ داررعایا کی غذا فراہم کرنے کے لئے مقررکیا جاتا ہے اس سلطنت میں

جاذبہ مقرر ہے، چونکہ برس کے بارہ مہینے اس سلطنت میں قحط رہتا ہے اس لئے ہر ضلع میں یہاں خاص طور کا جاذبہ مقرر ہے جو ادھر ادھر سے غذا فراہم کرتا رہتا ہے، چونکہ غذا کی آمد وشد نلکیوں کے ذریعہ سے ہے اس لحاظ سے سررشتۂ ریلوے سے بھی اس کا تعلق ہے، جس طرح کہ سررشتہ آب رسانی سے بھی ہے اوران کا افسر جاذبہ ہوگا، جب جاذبہ ہرایک کی روزی فراہم کردیتا ہے تو قوت غاذیہ جو قسمت ارزاق پر مامور ہے ہرایک کو اس کی حیثیت اورضرورت کے لحاظ سے روزی تقسیم کرتی ہے، محکمۂ آب رسانی بھی اسی سے متعلق ہے کیونکہ جب تک غذا سیال نہ ہو ہرعضو میں جانہیں سکتی اس لئے پانی کی ضرورت ہے، قوت ماسکہ خزانہ دار ہے جو ہرضلع ومقام میں آمدنی کی حفاظت کرتی ہے۔

تعمیرات عامہ: ہاضمہ سے متعلق ہے اس لئے کہ جو مقامات بوسیدہ اور تحلیل ہوجاتے ہیں ہاضمہ وقتاً فوقتاً بدل ماتحلل پہونچا کر تعمیر وترمیم کردیتا ہے اسی وجہ سے ہر عضو کا ہاضمہ جدا ہے، صیغہ کیمسٹری بھی اسی سے متعلق ہے، چونکہ غذا میں دوقسم کے اجزاء ہوتے ہیں بعضوں میں جزو بدن ہونے کی صلاحیت ہے اور بعضوں میں نہیں، ہاضمہ غذا کی تحلیل کرتا ہے، ابتداءً یہ کیمسٹری معدہ میں ہوتی ہے، کیلوس کے لطیف اورعمدہ اجزاء علحدہ کرکے جگر کی طرف بھیجتا ہے اور کثیف اجزاء بذریعہ قوت دافعہ آنتوں کی راہ سے نکال دئے جاتے ہیں، پھر جگر میں عمل تحلیل ہوتا ہے لطیف اجزاء بلغم ،خون، صفراء اورسوداء بنتے ہیں اور پھر خون کو گردوں میں صاف کرکے زہریلا فضلہ مثانہ

کی راہ سے نکال دیا جاتا ہے، پھر ان میں سے جو خون دل میں جاتا ہے وہاں لطیف اجزاء روح حیوانی بنتے ہیں اور فضلات ناک، کان، آنکھوں اور مسامات کی راہ سے نکال دیئے جاتے ہیں، اور جو خون اعضاء میں جاتا ہے وہاں قابل اجزاء اعضاء کے بننے میں صرف کئے جاتے ہیں اور باقی سے منی، ناخن اور بال وغیرہ بنتے ہیں۔

محکمۂ صفائی: قوت دافعہ سے متعلق ہے جو ہر مقام کی نالیوں اور موریوں وغیرہ کے میل کچیل اور فضلات دفع کر کے پاک وصاف کر دیتی ہے۔

محکمۂ افزائش نسل: کے افسر مولدہ اور مصورہ ہیں۔

ان کے سوا اور بہت سے محکمے اس سلطنت میں قائم ہیں جو بیان کئے گئے ان کو ''مشتے نمونہ از خروارے'' سمجھنا چاہئے۔

اگر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو ایک وسیع سلطنت پیش نظر ہو جائے گی، دیکھئے فلسفہ جدیدہ باوجود اس کے کہ انسان کے حصے علحدہ علحدہ کر کے ہر حصہ کے معلومات میں روز افزوں ترقیاں کر رہا ہے مگر خود اس کے اعتراف سے ثابت ہے کہ ہنوز روز اول ہے

۔

غرضکہ اس وسیع سلطنت کا بادشاہ نفس ناطقہ ہے اور کیسی کیسی متضاد اقوام اس سکونت

پذیر ہیں، مثلاً آب، آتش، باد، خاک، شجاعت، حلم، تکبر، تواضع، حسد، خیر خواہی، محبت، عداوت

رقیق، غلیظ، سخت، نرم، سرد، گرم، جاذبہ، دافعہ وغیرہ، مگر کوئی کسی پر تعدی نہیں کرسکتا، سب اس بادشاہ کے مطیع وفرمانبردار اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہیں۔

چونکہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف واقع ہوا ہے اسی لئے ایسے اسباب حق تعالی نے قائم کئے کہ خواہ مخواہ اس کو تمدن قائم کرنے کی ضرورت ہوئی، اور ہر ملک والے اس بات پر مجبور ہوئے کہ اپنے ہی ہم جنس بادشاہ کی اطاعت کریں، اور اس کو ایسے ذرائع دیئے گئے کہ سب رعایا و برایا اس کے محتاج ہوں، چونکہ آدمی کی نظر صورت پر پڑتی ہے اور بذریعۂ واہمہ اس کے اوصاف معلوم کرتا ہے اسلئے جو شخص بادشاہ کو دیکھتا ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ لوگوں کا بادشاہ ہے اور کسی کا محتاج نہیں، اور جو لوگ کامل العقل ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بادشاہ حقیقی کوئی اور ہی ہے، کیونکہ وہ بادشاہ ظاہری بات بات میں اپنے خالق کا محتاج ہے جس طرح انہوں نے اپنے مملکت ذاتی میں اپنے نفس ناطقہ کو بن دیکھے بادشاہ مان لیا، اسی طرح خالق عزوجل کو بھی ملک الناس مان لیا، اور جس طرح اپنے اعضاء وقویٰ کی حرکات کے نسبت یقین کرلیا کہ

بغیر ارادہ نفس ناطقہ کے کوئی ان سے حرکت صادر نہیں ہوسکتی اسی طرح عقل سے یقین کرلیا کہ عالم میں کوئی حرکت بغیر ارادۂ بادشاہ حقیقی کے صادر نہیں ہوسکتی **لاتتحرک ذرۃ الا باذن اللہ** یہ ہیں معنی مَلِکِ النّاس کے۔

نفس ناطقہ کی سلطنت اور بادشاہوں کی سلطنت میں یہ فرق ضرور ہے کہ ان کے حکم کے نافذ ہونے میں بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں یہاں تک کہ رعب قائم رکھنے

کے لئے عدول حکمی کرنے والوں کو پھانسی تک دینے کی ضرورت ہوتی ہے، اس پر بھی کوئی حکم ان کا اس سرعت سے نافذ نہیں ہوسکتا جیسے نفس ناطقہ کا حکم نافذ ہوتا ہے، دیکھئے جب کوئی موذی اور مفسد سلطنت کی اطلاع باصرہ دیتا ہے تو پہلے متعلقہ دفتروں میں تلاش ہوتی ہے کہ اس قسم کے مفسد پرداز کی عرض ومعروض کبھی ہوئی تھی یا نہیں؟ اگر نہیں ہوئی تھی تو واہمہ فوراً جانچ کر کے عرض کر دیتا ہے کہ وہ مثلاً قابل قتل ہے، اور یہ مسل بھی ان مسلوں کے ساتھ دفتر میں رکھی جاتی ہے پھر فوجی افسروں کو حکم نافذ ہوتا ہے چنانچہ وہ قتل کیا جاتا ہے۔

دیکھئے اتنے کام اس سرعت سے ہوتے ہیں کہ ادھر بچھو دکھائی پڑا اور ادھر اس پر جوتا پڑا! ابتدائی کارروائی سے نفاذ حکم بلکہ تعمیل حکم یعنی قتل تک ایک سکنڈ کا عرصہ بھی نہیں گزرتا، اسی طرح کسی تعجب خیز بات پر نفس مطلع ہوتا ہے تو اندرونی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا بیان نہیں ہوسکتا اور اس کے ساتھ ہی عضلات وغیرہ اپنے اپنے کاموں پر مستعد ہوجاتے ہیں، ادھر تنفس میں ایک غیر معمولی جوش پیدا ہوتا ہے یہاں تک کہ آواز بلند ہوتی ہے اور جلد جلد حرکت کرنے لگتی ہے، ادھر اوتار وغیرہ مقامی عملہ ہونٹوں پر مسلط ہوکر ان کو دانتوں پر سے ہٹا دیتا ہے، چہرہ پر ایسی چیزیں فراہم کردی جاتی ہیں جو آثار بشاشت ہیں جن سے دیکھنے والوں پر بھی خوشی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور باہمی انسیت پیدا ہوتی ہے، اور اگر باطن میں غم وغصہ آجائے کارگزاران مقامی آثار بشاشت سے چہرہ کو فوراً پاک وصاف کر کے آنکھوں میں ایک قسم کا انقلاب پیدا کر دیتے

ہیں یہاں تک کہ کبھی آنسو جاری ہوجاتے ہیں جو کمالِ غم کی علامت ہے اس قسم کے اور بہت سے حرکات اعضا سے صادر کراتے ہیں، بلکہ بسا وقت ایسی حرکات صادر کرادیتے ہیں جن سے حیثیت عرفیہ کا ازالہ ہوجاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انقلاب بے سبب نہیں ہوتا، مثلاً نفس میں تعجب کے وقت کوئی کیفیت ضرور پیدا ہوتی ہے، مگر یہ نہیں معلوم کہ تعجب ہے کیا چیز؟ ہم دیکھتے ہیں کہ کمال درجے کی خوشی سے بھی آدمی ہنستا ہے یہاں تک کہ بعضے شادی مرگ کا شکار ہوجاتے ہیں کہ ہنستے ہنستے مرجاتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے اور گدگدیاں کرنے سے بھی آدمی بے اختیار ہنستا ہے، اور کبھی کسی کی دل شکنی اور رنج اور مصیبت پر بھی ہنستا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک بار نماز جماعت سے ہورہی تھی جس کے امام خود آنحضرت ﷺ تھے ایک نابینا کمالِ شوق سے جماعت میں شریک ہونے کو آرہے تھے اتفاقاً گڑھے میں گر پڑے اس پر بعض بے اختیار ہنس پڑے جس کی سزا میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: تم لوگوں کی نماز بھی ٹوٹی اور وضو بھی ٹوٹا، دیکھئے یہ نابینا بزرگ کس شوق وذوق سے جماعت میں شریک ہونے کو آرہے ہوں گے اور جوں جوں صف کے قریب ہوتے ہوں گے کس قدر ان کو خوشی ہوتی ہوگی اور شکر کرتے ہوں گے کہ الحمد للہ محنت چیز ہوگئی اب کوئی دم میں اس جماعت سراپا رحمت میں شریک ہوجاتے ہیں جس کے امام خود نبی کریم ﷺ ہیں، تقرب الٰہی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں رحمت اور صلاۃ وسلام حق تعالیٰ کی طرف سے اس جماعت پر پیہم نازل ہورہے ہیں، فرشتے ہر طرف

صف باندھے ہوئے دعا گوئی میں مشغول ہیں، حق تعالی خاص طور پر اپنے نبی کریم ﷺ اور اس جماعت کی طرف متوجہ ہے اور ہر شخص کو معراج حاصل ہے جس سے اظہار راز و نیاز کا پورا موقع مل رہا ہے، ایسے وقت جب وہ بزرگ نابینا گر کر اس دولت سے محروم ہو گئے ہوں گے تو ان کے حسرت بھرے دل کا کیا حال ہوا ہوگا، اگر آٹھ آٹھ پہر آنسو اس پر بہائیں تو سزاوار ہے یہ تو ان کی حالت تھی، ادھر اتقیاء کی جماعت جن کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی ان پر اس گرنے اور محرومی کا اثر یہ ہو رہا ہے کہ بے اختیار ہنس پڑے ،صحابہؓ کا اس وقت ہنسنا معلوم نہیں کس مصلحت سے تھا؟ اور خدا جانے اس وقت کس قسم کے معارف ان کے دلوں پر متجلی تھے جن سے فرحت و بشاشت ہوئی اور بے اختیار ہنس پڑے، بارہا دیکھا گیا ہے کہ ہنسی ہنسی میں رو دیتے ہیں اور روتے روتے ہنس دیتے ہیں ،اسرار خالقیت کا انکشاف ہر کس و ناکس پر نہیں ہوسکتا، ع:

بگوشِ گل چہ سخن گفتہ ای کہ خندان است
بہ عندلیب چہ فرمودہ ای کہ گریان است

ہر چند ان حضرات کی ہنسی کو ہم اپنی ہنسی پر قیاس نہیں کر سکتے، کیونکہ
کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

مگر چونکہ حکم شریعت عام ہوتا ہے اس میں خصوصیات باطنی کا لحاظ نہیں ہوتا اس لئے اس سزا میں وہ حضرات شامل کر دئے گئے، دیکھئے صاف ارشاد ہے مَنْ تَشَبَّہَ

بِقَوْمٍ فَھُوَمِنْھُمْ یعنی جوشخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ ان ہی میں سے ہے یعنی اس کے باطن کا لحاظ نہیں، الحاصل ضحک اور غضب وغیرہ سے یہ ثابت ہے کہ نفس ناطقہ جو حکم کرتا ہے اس کی تعمیل ایسی فوراً ہوتی ہے کہ حکم اور تعمیل میں گویا زمانہ فاصل ہی نہیں۔

اب دیکھنا چاہئے کہ نفس ناطقہ کی حکومت اس کی سلطنت میں اس درجہ کیوں نافذ ہے کہ اس سے سرتابی کوئی نہیں کرسکتا اور سلاطین کی حکومت میں یہ بات نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ نفس ناطقہ کو خاص قسم کا تعلق اس کی سلطنت سے دیا گیا ہے چنانچہ اس کی مفارقت سے تمام سلطنت درہم وبرہم ہوجاتی ہے یعنی جسم فنا ہوجاتا ہے، اور یہ تعلق سلاطین کو ملک کے ساتھ نہیں۔

اب غور کیجئے کہ اس عطائی اور عارضی تعلق سے نفس کو یہ بات حاصل ہے کہ اس کا کوئی حکم اس کے ملک میں رد نہیں ہوسکتا تو خالق عالم جس کے ساتھ تمام عالم کو ایسا ذاتی تعلق ہے کہ ہر آن وہ اس کا محتاج بنا ہوا ہے، صحابہؓ کے مذکورہ واقعات کو دیکھئے کہ ان پر جب نفس ناطقہ کے پیادے مسلط ہوئے اور وہ انقلاب پیدا کردیا جو ابھی مذکور ہوا تو ان پر کس قدر شاق گزرا ہوگا، اور اس کے رفع کرنے میں کیا کچھ کوششیں نہ کی ہوں گی! مگر کچھ نہ چلی انجام کار نفس ناطقہ ہی کا حکم چل گیا اور قہقہہ کی آواز کو باہر نکال کر چھوڑا یہاں تک کہ ہنسی کا پورا نقشہ قائم کردیا، معلوم نہیں اس وقت ہنسانے والی قوت کیوں مسلط ہوگئی تھی؟ اگر کسی کا نقصان اور دل شکنی ہنسی کے اسباب میں ہے تو چاہئے کہ اپنا پیا

رالڑکا اور واجب التعظیم بزرگ گریں تو بھی ہنسی آنی چاہئے! حالانکہ نہیں آتی احمقی کے حرکات دیکھنے سے بھی ہنسی آتی ہے، مگر اپنے کسی معزز دوست سے دیکھے جائیں تو بجائے ہنسی کے رنج ہوتا ہے اور شرم آتی ہے۔

غرضکہ تعجب جو باعث ضحک ہے اس کو معین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ جس بات پر ایک شخص ہنستا ہے دوسرا نہیں ہنستا، بلکہ ہم ہی جس بات پر ایک وقت ہنستے ہیں دوسرے وقت نہیں ہنستے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی شے کو ہنسانے اور رلانے میں دخل نہیں بلکہ وہ خدا ہی کا کام ہے جب چاہتا ہے ہنساتا ہے اور جب چاہتا ہے رلاتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے قولہ تعالیٰ: ھُوَ الَّذِیْ اَضْحَکَ وَاَبْکٰی یعنی وہی خدا ہنساتا ہے اور رلاتا ہے جب ہنسانا چاہتا ہے تو نفس میں ایسی کیفیت پیدا کردیتا ہے کہ آدمی ہنس دے، اور جب رلانا چاہتا ہے تو کوئی بات ایسی پیدا کردیتا ہے کہ آدمی بے اختیار رو دے، یہاں تک کہ ہنسنے کے قابل بات میں بھی کبھی رلا دینے کی خاصیت دی جاتی ہے، عقل سے اس کا واقعی سبب ہرگز نہیں معلوم ہوتا جس سے تصدیق آیت موصوفہ کی ہوسکے کہ خدائے تعالیٰ ہی ہنساتا اور رلاتا ہے اور بظاہر جو اسباب قائم ہوتے ہیں ان کا مسبب وہی ہے۔

اس قسم کے امور اکثر نفس ناطقہ کی ساخت ہی میں داخل ہوتے ہیں، چنانچہ تاریخ حکمائے یونان میں لکھا ہے کہ دیموقراطیس جو بڑا نامی حکیم و فلسفی گزرا ہے وہ بہت ہنستا تھا یہاں تک کہ جس طرح خوشی کی حالت میں ہنستا غم کی حالت مین بھی ہنستا تھا، اس

کے خیر خواہوں نے دیکھا کہ یہ بالکل غیر معمولی بات ہے، اس کو جنون پر محمول کیا اور شہر بدیرہ جس میں وہ رہتا تھا وہاں کے لوگوں نے اس کے علاج کے لئے حکیم بقراط کو بلایا چنانچہ وہ جنون کی دوائیں ہمراہ لایا، پہلے اس نے دودھ پیش کیا دیموقراطیس نے غور سے اس دودھ کو دیکھ کر کہا: یہ ایسی بکری کا دودھ ہے جس کا رنگ سیاہ ہے اور وہ باکرہ بھی ہے! فی الواقع اس کی بات صحیح نکلی، بقراط اس کی فراست سے متعجب ہوا اور کئی روز وہاں رہ کر مسائلِ حکمیہ کی تحقیق کی اور اس کی غیر معمولی حکمت سے متعجب ہو کر کہا کہ: اس شہر کے لوگ اس قابل ہیں کہ ان کے جنون کا علاج کیا جائے نہ کہ یہ حکیم۔

غرضکہ فاعل مختار نے جس کو جیسا چاہا پیدا کیا، کسی کو کثیر الضحکؔ کسی کو کثیر البکاء، پھر جس کو جب چاہتا ہے ہنساتا ہے، اس کی مصلحت وہی جانے اس کا حکم عالم میں کیونکر رد ہو سکے، اسی وجہ سے انبیاءؑ دعاء کیا کرتے تھے کہ الٰہی قوم کو ہدایت دے اور راہ راست پر لا، اس سے ظاہر ہے کہ کفار کے دل خدا ہی کے ہاتھ میں ہیں، اور حکم ایمان جب ان کے ذریعہ سے کفار کو پہونچتا ہے وہ ایسا ہے جیسے نفس ناطقہ کا حکم اعضاء پر بذریعۂ کلام وزبان پہونچے کہ حرکت کرو! اگر صبح سے کہا جائے تو ممکن نہیں حرکت کر سکے جب تک کہ نفس ناطقہ کا اندرونی حکم اس کو نہ پہونچے، اسی طرح خدائے تعالی کا امر تکوینی جو باطن میں صادر ہوتا ہے وہ ہر گز رد نہیں ہو سکتا۔

اب رہی یہ بات کہ بغیر امر تکوینی کے مقصود حاصل نہیں ہوتا تو انبیاءؑ کی ضرورت ہی کیا؟ اس سوال کا حق کسی کو نہیں ہے، خالق مختار ہے جو چاہے کرے بندے کا

کام اطاعت ہے، اگر وہ ہوسکے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ آثار کچھ اچھے ہیں اور امید بخشائش ہے، ورنہ آثار ٹھیک نہیں جب قیامت میں آنکھیں کھل جائیں گی اس وقت خدا کی حجت قائم ہوجائے گی کیونکہ وہ **مَلِکِ النَّاسِ** ہے اپنی سلطنت میں جو چاہے کرے اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا۔

دیکھئے نفس ناطقہ داڑھی کہ بلکہ کسی مصلحت سے ہاتھ پاؤں کو کٹوا دیتا ہے اور کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ میرا کیا قصور تھا، اسی طرح خدائے تعالی سے کوئی پوچھ نہیں سکتا جس طرح اس کی مصلحت مقتضی ہوتی ہے عمل میں لاتا ہے۔

اِلٰہ

اِلٰہ کے معنی معبود کے ہیں مگر اس کے ماخذ میں اختلاف ہے، بعضوں کا قول ہے کہ ولہ سے ماخوذ ہے، اور ولہ اس حرکت کو کہتے ہیں کہ آدمی کسی مصیبت اور آفت کے وقت گھبرا کر اپنے مربی اور حامی کی طرف رجوع کرتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے **وَلِـــــہَ الطفل الی امہ** یعنی بچہ گھبرا کر اپنے ماں کی طرف لپکا، اس صورت میں الہ کی اصل ولاہ ہوئی، اور جس طرح ''وشاح'' میں واؤ الف سے بدلا گیا یہاں بھی بدلا گیا اور معنی یہ ہوئے کہ: الہ وہ ذات ہے کہ جس کی طرف کل آفتوں میں لوگ گھبرا کر رجوع کریں۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اِلٰہ اپنے اصل پر ہے جس کا وزن فعال، اور معنی مفعول ہے، جیسے اِمام اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کی اقتداء کی جائے

''الوہت''اور''الوہیت'' کے معنی عبادت کے ہیں اس صورت میں اِلٰہ بمعنی معبود ہوا، ہر چند کہ بہت سے لوگ خدائے تعالی کے سوا غیروں کی بھی عبادت کرتے ہیں اور گھبراہٹ کے وقت اوروں کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں مگر خدائے تعالی فرماتا ہے کہ سب آدمیوں کے الٰہ ہم ہیں تو اس سے سمجھا جاتا ہے کہ یہ باعتبار واقع وحقیقت کے ارشاد ہے ، کیونکہ عالم میں کوئی ایسا نہیں جو معبود یا ہر حال میں پناہ دینے والا بن سکے، جس کو دیکھئے خود محتاج ہے، چنانچہ ارشاد ہے اَللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ، پھر اگر کسی کی پناہ لینے والا اپنے اعتقاد کی نظر سے گنہگار ہوگا مگر دراصل وہ اللہ ہی کی پناہ میں ہوتا ہے، اس لئے کہ جب تک حق تعالی نے اس کو اس عالم میں باقی رکھنے کا ارادہ فرمایا ہے تو اس وقت تک تمام آفات مہلکہ سے بچانا ایک لازمی امر ہے۔

اللہ تعالی کی پناہ:

اگر بالفرض خدائے تعالی اس کو پناہ نہ دے اور اس کا دشمن اس کو ہلاک کردے تو خلاف مشیت وتقدیر ہوگا، اس صورت میں اِلٰہِ النَّاسِ ہونا ہر طرح خدائے تعالی ہی کو مسلم ہوا گو کسی دوسرے سے پناہ لے البتہ اللہ تعالی کو چھوڑ کر دوسرے کی پناہ لیا اور حمایت میں جائے اور اس کو مستقل سمجھے تو بحسب خیال کافر یا گنہگار ہوگا، اور دوسرے کی پناہ یا حمایت کو اللہ ہی کی پناہ اور حمایت سمجھے تو اس عقیدہ کی وجہ سے کوئی الزام اس پر عائد نہیں

ہوسکتا کیونکہ یہاں توحید الوہیت مقصود ہے، جیسے رب الناس میں توحید ربوبیت مقصود تھی ،اس طرح جس کی عبادت کی جاتی ہے دراصل وہ خدا ہی کی عبادت ہوگی کیونکہ سوائے اللہ تعالی کے اور کوئی معبود ہو ہی نہیں سکتا، مگر جس نے اپنی دانست میں غیر اللہ کو قابل عبادت سمجھا اور اِلٰہ الناس جو نص قطعی ہے اس کی مخالفت کی تو ضرور مستحق عذاب ہوگا۔

الوھیت :

اس صورت میں الوہیت ایک ہی ذات میں منحصر ہوگی اور لااِلٰـہ غیـرک کے معنی صادق آ گئے ،یعنی کوئی الہ بحیثیت غیر نہیں ، کیونکہ سوائے اللہ تعالی کے کسی کی عبادت نہیں ہوسکتی ،البتہ باعتبار ذات کے غیر ہے کیونکہ وہ خالق قدیم ہے اور یہ مخلوق حادث دونوں کیونکر ایک ہوسکیں ، ہر چند ہر عابد اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے مگر مشرکوں کے خیال میں یہ نہیں ہوتا کہ ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں ،حق تعالی فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ یعنی میں نے جن وانس کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں ،اور اسی وجہ سے مشرک اور وہ لوگ جو اس عالم میں خدا کی عبادت نہیں کرتے دوسرے عالم میں دوزخ میں ڈالے جائیں گے،

کیونکہ قید خانہ کی خاصیت ہے کہ وہاں اللہ یاد آتا ہے ، چنانچہ مولانا رومؒ

فرماتے ہیں:

جملہ رنداں چونکہ درزنداں روند

متقی وزاہد وحق خواں شوند

چونکہ اصل عبادت یادالٰہی ہے وہ دوزخ میں بھی ہوا کرے گی اوراللہ کووہاں بھی بصدق دل خوب پکاریں گے ،اور جولوگ اس عالم میں عبادت کرچکے وہ اس عالم میں عبادت سے معاف کئے جائیں گے کیونکہ جنت دارتکلیف نہیں ہے ،حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطاء فرمائے کہ اس عالم میں عبادت کی تکلیف اٹھاکر اس عالم میں فارغ البال ہوجائیں۔

شر

شَرّ ضد خَیر ہے ،اس آیت شریفہ میں شیطانِ وسوسہ انداز کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم ہے ،اس سے ظاہر ہے کہ پناہ مانگنے کے قابل شیطان کا شر ہے نہ کہ شیطان، کیونکہ فی نفسہ اس سے ہمیں کوئی تعلق نہیں اگرہمیں وہ شر نہ پہنچائے تومثل اور اشیائے عالم کے وہ بھی ایک شئے ہوگا جس سے نہ بھلائی کی امید نہ برائی کا خوف اس میں شک نہیں کہ کسی کوشر یا خیر پہونچانا کسی کی قدرت میں نہیں جب تک خدائے تعالیٰ نہ چاہے کوئی شر پہونچاسکتا ہے نہ خیر، دیکھئے ہرآدمی کے کس قدر دشمن ہیں! پہلے سب سے بڑادشمن اسی کانفس ہے جیسا کہ ارشادنبویؐ ہے :أعدیٰ عدوک نفسک التی

بیــــن جــنبیک ، کیونکہ تمام شروفساد کا مبداء نفس ہی ہے،اس لئے کہ جتنی نفسانی خواہشیں ہیں سب اسی میں ہیں،اگر ان خواہشوں کو آدمی پوری کرنا چاہے تو خسـر الـدنیـا والآخـرۃ ہوجائے،مثلاً جب خواہش نفسانی کے جوش کے وقت کسی خوبصورت عورت سے ملوث ہوجائے تو ظاہر ہے کہ دنیا ہی میں کیسی کیسی مصیبتیں بھگتنی پڑیں گی اور آخرت میں کیا حشر ہوگا ؟! علی ہذاالقیاس کل نفسانی خواہشوں کا بھی یہی حال ہے قید خانے جتنے بھرے ہوئے آپ دیکھتے ہو سب نفس ہی کے کرتوت سے ہیں،جس کو آپ پریشان یا مصیبت زدہ پاؤ گے اس کا اصلی سبب نفس ہی کی کارسازی ہوگی ،غرضکہ سب سے بڑا دشمن ہماری ہی ذات میں ہے جس سے ہم بھاگ نہیں سکتے ،پھر ہماری اہل واولاد جن کو ہم سب سے زیادہ دوست سمجھتے اورعزیز رکھتے ہیں وہ بھی ہمارے دشمن ہیں حق تعالی فرماتا ہے اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَـاحْـذَرُوْھُـمْ یعنی تمہاری بعض ازواج اوراولاد تمہاری دشمن ہے،اس کے بعد اہل قرابت ہیں چنانچہ کسی بزرگ کا قول ہے الاقـارب کـالعقارب ان کے بعد دوسرے لوگ علی حسب مراتب ہیں العم الغم ،الاخ الوخ۔

یہ تو ہم جنس کا حال تھا اس کے بعد جنات وشیاطین بھی ہمارے دشمن ہیں جن کو ہم نہیں دیکھتے اور وہ ہمیشہ ہمارے گردوپیش رہتے ہیں اور ہم پر مسلط ہوسکتے ہیں پھر حیوانات میں اگر دیکھتے ہیں تو بے انتہا موذی جانور ہیں جن کا شمار نہیں،ان کے سوا بیماریاں بھی بے انتہا ہیں اگر شفاخانوں میں چندروز جا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کیسی کیسی

آفتوں میں لوگ مبتلا ہیں ان سب بیماریوں کے اسباب وہی اخلاط ہیں جو ہم میں موجود ہیں ان کی کمی وزیادتی اور انحراف ان ہی غذاؤں سے ہوتا ہے جو ہم ہر روز کھاتے ہیں۔

غرض ان تمام اسباب شر پر نظر ڈالی جائے تو ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت اور آفت میں مبتلا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ بے انتہا دشمنوں میں سے اگر ایک دو بھی ہر روز مسلط ہوتے رہیں تو ممکن نہیں کہ آدمی آسائش سے بسر کر سکے، مگر جب تک حق تعالی کو منظور ہوتا ہے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

اسباب:

الحاصل خیر وشر کا پہونچانا خاص اللہ تعالی کا کام ہے اسی وجہ سے جن حضرات کو اس امر کا مشاہدہ رہتا ہے وہ وسائط کو نظروں سے ساقط کر دیتے ہیں اور کسی چیز کی برائی اور بھلائی پر ان کی نظر بھی نہیں پڑتی ہمیشہ ان کو صفات الہیہ میں استغراق رہتا ہے، ان کی نظروں میں سانپ اور لکڑی یکساں ہیں دونوں کو اس بات میں برابر سمجھتے ہیں کہ بغیر مشیت وارادۂ الہی کے وہ کچھ نہیں کر سکتے، اگر چہ اس صفات کے حضرات بہت اعلی درجے کے ہیں اور ہمیشہ ان کو قرب الہی حاصل ہے، مگر ان سے بڑھے ہوئے وہ عارفین ہیں کہ جس طرح خدائے تعالی نے عالم میں اسباب مقرر کئے ہیں ان کو وہ بیکار نہیں سمجھتے مضر چیز کو مضر اور مفید کو مفید جانتے ہیں، خدائے تعالی نے جس کی طرف برائی

منسوب کی اس کو برا سمجھتے ہیں اوراس سے احتراز کرتے ہیں،مگرمؤثر اور فاعلِ مطلق حق تعالی ہی کو جانتے ہیں ،وہ اسباب کے قائل ہیں مگر ان کو مستقل نہیں سمجھتے ،یوں تو ہر مسلمان کا دعوی ہے کہ یہی میرا عقیدہ ہے مگرغور کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ دعوی کہاں تک صحیح ہے! ہمیشہ دیکھنے اور سننے اور تجربوں سے اسباب کی اس قدر تاثیر ذہن میں متمکن ہے کہ مسبب تعالی شانہ کا خیال بھی نہیں آتا،اور اگر کہنے سننے سے آ بھی گیا تو وہ دیرپا نہیں ،عاقل وہی ہے کہ اس خیال کو پختہ کرے اور اعتقاداً اور عملاً فرمان الٰہی بجالائے جس کا نتیجہ اس طرح برآمد ہوگا جیسا کہ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

تو ہم گردن از حکم داور پیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

اور تمام دشمنوں پر اس کا غلبہ حاصل ہوگا۔

یہ ہر شخص جانتا ہے کہ کہنے سننے کا برا اثر ہوتا ہے،جب عارضی سننے کا یہ اثر ہو تو ابتدائے نشو ونما سے جو باتیں ہر وقت سنی جاتی ہیں اور صرف سننا ہی نہیں بلکہ ذاتی مشاہدے بھی اس کے ساتھ ہوں تو ان کا کس قدر اثر ہونا چاہیئے؟

دیکھئے کہ قبل اس کے کہ آدمی ہوش سنبھالے دیکھتا ہے کہ ماں کی آغوش تربیت میں پرورش پا رہا ہے،نہ کوئی اس حالت میں اس کا مونس ہے نہ مددگار اس وقت اس کا یہی خیال ہوتا ہے کہ تمام عالم میں اگر کوئی اپنا مربی اور پرورش کرنے والا ہے تو وہی ایک ماں ہے،اس سے آگے اس کی نظر نہیں بڑھ سکتی ،جب اس کو کوئی حاجت ہوتی ہے تو ماں

ہی کی طرف رجوع کرتا ہے غرضکہ اس وقت اس کی ماں اس کے حق میں ہر مرض کی دوا ہے ، پھر جب ہوش سنبھالتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ماں بات بات میں باپ کی محتاج ہے جب تک وہ کچھ نہ دے کچھ نہیں کرسکتی ، اسوقت باپ کی وقعت اس کی نظروں میں پیدا ہوتی ہے، اور جوں جوں باپ کی طرف سے اس کی پرورش کے سامان ہوتے جاتے ہیں اور اس کا ادراک بڑھتا جاتا ہے سمجھتا ہے کہ اپنی پرورش کا مدار باپ پر ہے اس وجہ سے اس سے محبت پیدا ہوتی ہے، اس وقت جس قدر اس کی نظروں میں باپ کی وقعت ہوتی ہے کسی دوسرے کی نہیں ہوتی اور باپ سے بہتر کسی کو نہیں سمجھتا، اس کے بعد جب شعور آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اپنا باپ اور سب کنبے والے بلکہ سب شہر اور ملک کے لوگ بادشاہ کے محتاج اور فرماں بردار ہیں اور وہ جس طرح چاہتا ہے ملک میں تصرف کرتا ہے اور اہل ملک کے خوف ورجاء اسی سے متعلق ہیں تو بادشاہ کی عظمت ووقعت ایسی ذہن نشین ہوتی ہے کہ کسی دوسرے کی نہیں ہوتی ، پھر جس قدر عقل کامل ہوتی جاتی ہے بادشاہ کی اطاعت وفرمانبرداری کو ضروری سمجھتا ہے، غرضکہ مخلوق ہی کی طرف ہر وقت نظر اس کی لگی رہتی ہے جس سے خدائے تعالی کی طرف متوجہ ہونے کا اس کو موقعہ ہی نہیں ملتا، اگرچیکہ اس عرصہ میں واعظوں اور اساتذہ وغیرہ سے سنتا ہے کہ تمام عالم کا خالق خدائے تعالی ہے اور دیکھتا بھی ہے کہ ہر قوم اور ملت کے لوگ اپنے اپنے طریقوں پر خدا کی عبادت کرتے ہیں ، اور عقل سے بھی معلوم کرسکتا ہے کہ زمین وآسمان وغیرہ کا پیدا کرنا کسی آدمی کا کام نہیں اس لئے اس کا کوئی خالق ضرور ہے جو سب کی حاجتوں کی اشیا

ءکوغیب سے فراہم کرتا ہے،مگر چونکہ خدائے تعالی اوراس کے تصرفات مخفی طور پر ہیں اور ابتدائے پیدائش سے جب اس کی نظر پڑی تو لوگوں ہی کے تصرفات اورحاجت روائیوں ہی پر پڑی اس لئے اس کا یہ خیال پختہ نہیں ہوتا کہ عالم میں کل تصرفات خدائے تعالی ہی کے جاری ہیں اگر چہ یہ ممکن تھا کہ جب حق تعالی کو خالق عالم سمجھا اور ہر قوم کے لوگوں کواس کی عبادت کرتے پایا تو جس طرح بادشاہ کی وقعت سب سے زیادہ اس کے ذہن نشیں ہوئی تھی حق تعالی کی وقعت اس سے زیادہ ہوتی ،مگر شیطان اس کو وہاں جمنے نہیں دیتا،اس وجہ سے کہ عزازیل کو پہلے ظاہراً تقرب الٰہی حاصل تھا۔

جب آدمؑ کوخلعتِ خلافت عطاء ہوئی اورتمام ملائک سے ان کی تعظیم وتوقیر اورسجدے کرائے گئے اس کو بھی سجدے کا حکم ہوامگر کثرتِ عبادت کے گھمنڈ پر انکار کیا اورتقرب الٰہی سے دور پھینکا گیا جس کی وجہ سے اس کا نام شیطان ٹھہرا،کیونکہ شیطان کے معنی لغت میں دور کے ہیں،غرضکہ اس وقت سے آدمؑ کا جانی دشمن ہوگیا اوران کی وجہ سے ان کی اولاد کا بھی دشمن ہوا،چنانچہ حق تعالی فرماتا ہے اِنَّ الشَّیطَانَ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْن پہلے وہ آدمؑ کے سر ہوا یہاں تک کہ ان کو جنت سے زمین پر لاکر چھوڑا،ان کے بعد ان کی اولاد کوخدا کی راہ سے بھٹکانے کا بیڑا اٹھایا اورقسم کھالی کہ گو یہ خلیفہ زادے ہیں مگر ان کو بھی خدا کے راستہ سے ایسا بھٹکادوں گا کہ اس راستہ میں قدم نہ رکھنے پائیں،چنانچہ حق تعالی نے اس کا قول نقل کیا ہے فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ اوردل میں یہ بات ٹھان لی کہ جس طرح ہوسکے دشمن اوراس کے خاندان کواگر تباہ نہ کردوں تو میں جن

نہیں ! اورعرض کیا کہ مجھ ستم رسیدہ اتنا فضل فرما کہ جب تک ان کی اولا د روئے زمین پر رہے مجھے بھی رہنے کی اجازت ہوتا کہ میں بھی اپنی سوزش دل کو ٹھنڈی کروں ، چونکہ خدائے تعالی رب العالمین ہے سب کی سنتا ہے خصوصاً شکستہ دلوں کی ،اس بارگاہ میں بہت کچھ چل جاتی ہے ،ارشاد ہوا کہ ہم نے مہلت منظور کی ،اس کے بعد درخواست کی کہ ان کے گرفتار کرنے کے چند دام بھی عنایت ہوں تو موجب کرم ہے جیسا کہ مولانائے رومؒ فرماتے ہیں:

گفت ابلیس لعین داوار را
دام زفتے خواہم ایں اشکار را
زروسیم وگلۂ اسپش نمود
کہ بدیں ثانی خلائق رار بود
گفت شاباش ونشد زیں شادکام
لیک افزوں بایدم زیں دام دام
پس زروگوہر زِ معدن ہائے خوش
کرد آں پس ماندہ راحق پیش کش
گیرایں دامِ دگرراا ے لعیں
گویدافزوں دہ مرا نعم المعیں

چرب شیریں وشراباتِ ثمیں

دادش و صد جامہ وابریشمیں

گفت یارب بیش ازیں خواہم مدد

تابہ بندم شان بحبلٍ مِن مَسد

غرض اس قسم کے بہت سے اسباب ضلالت دیئے گئے جس کی تصدیق آیت شریفہ سے ہوتی ہے قولہ تعالیٰ کُلًّا نُمِدُّ ھٰٓؤُلَآءِ وَھٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّکَ وَمَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًا یعنی ہم ہر ایک کو مدد دیتے ہیں اور اِن کو بھی اور اُن کو بھی اور تمہارے رب کی عطا سے کوئی محروم نہیں۔

مکاید شیطان:

اور ارشاد ہوا کہ جس طرح تجھ سے ہو سکے اپنی ذات سے اور اپنے لشکر کی مدد سے اطمینان کے ساتھ اپنے دل کے حوصلے پورے کر، کما قال تعالیٰ وَاَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِکَ وَرَجِلِکَ بلکہ ان کے دلوں پر بھی تجھے تصریف عنایت کرتے ہیں تو ان کی نظریں بچا کر اندر ہی اندر مخالفانہ مشورے دیا کر، مگر یہ یاد رکھنا کہ جو خاص ہمارے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔

غرضکہ خدا سے پروانگی مل گئی، اب کیا تھا نہایت بے باکی اور اطمینان سے

ایک مستقل سلطنت اپنی قائم کرلی اوران ذرائع کی تلاش میں مصروف ہوا جن سے لوگ اللہ سے دور ہوکر لقب ''شیطان'' کے مستحق ہوں۔

دیکھا کہ ہر شخص بقائے شخصی اور بقائے نوعی کا دلدادہ ہے اور یہی چاہتا ہے کہ آپ اور اپنی نوع باقی رہے بس یہیں اس نے اپنا ٹھکانہ جمالیا اور ہر ایک کو یہ مشورہ دینے لگا کہ: تمہاری پرورش بھی ماں باپ سے متعلق تھی، اسکے بعد دوسرے اسباب وذرائع سے متعلق ہوئی جن کوتم خوب جانتے ہواور تمہارے ذاتی تجربے ہیں، اور بقائے نوعی سلاطین سے متعلق ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتو تمدن درہم اور برہم ہوجائے اور درندے اور درندہ خولوگ تمہیں پھاڑ کھائیں اور بعض اولڈ فیشن کے (یا بنیاد پرست) لوگ جوخدا کا خیال کرتے ہیں سواول تو خدا کوکس نے دیکھا! اور اگر ہوبھی تو خدا جانے کہاں ہے؟ نیوفیشن والوں (اور ترقی پسندوں) کی عقل کا مقتضی تو یہ نہیں کہ ایسے موہوم خیالات پر آدمی بھروسہ کرے اور اپنے ذاتی تجربوں پر اعتماد نہ کرکے ہر بات میں اللہ کو پکارے اور اس کی عبادت میں اپنا وقت ضائع کرے!۔

ہر چند اللہ تعالی نے اس کے مقابلے کے لئے انبیاء کو بھیجا کہ اپنے بھائیوں اولاد آدمؑ کو شیطان کے مکر وفریب پر مطلع کرکے خدائے تعالی سے ان کو قریب کردیں، انہوں نے بہتر سمجھایا کہ: بھائیو! خدائے تعالی ہی رب العالمین اور سب کا پرورش کرنے والا ہے، اور وہی تمام جہاں کا بادشاہ ہے اور بادشاہ بھی کیسا ''مالک الملک یؤتی الملک من یشاء ''یعنی جس کو چاہے بادشاہ بنادے ظاہراً انہوں

نے بہت کچھ سمجھایا مگر ان کی کچھ نہ چلی کیونکہ شیطان اندر ہی اندر دلوں میں یہ وسوسے ڈالتا جاتا ہے کہ دیکھو اگر تم ان لوگوں کی بات مان لوگے اور دنیا کے کاروبار چھوڑ کے خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ گے تو سردست تمہیں فقر و فاقہ کی مصیبت بھگتنی پڑے گی، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے اَلشَّیْطَانُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان فقر سے متعلق وسوسے ڈالتا ہے اور گویا وعدہ کرتا ہے کہ جہاں تم نے انبیاء کی سنی فقیری تم پر آ گئی! اور بادشاہ اور تمہارے آقا جب تمہیں دیکھیں گے کہ تم خدا کی طرف متوجہ ہو تو یہی کہیں گے کہ یہ ہمارے کام کے نہیں اور کوئی عہدہ تمہیں نہ ملے گا، غرضکہ ان کو پیٹ کے دھندوں اور جاہ طلبی میں ایسا مصروف کر دیتا ہے کہ خدا کا خیال بھی کبھی نہ آنے پائے۔

پیغمبروں نے ہزار طرح سے سمجھایا اور خدا کا کلام پڑھ پڑھ کر سنایا تب بھی ان ''وسوسوں'' کے مقابلے میں کچھ اثر نہ ہوا، وسوسے جو فی الحقیقت شیطان ان کو مشورے دیتا ہے ان کے سامنے وہ ایسے متذلل اور فرماں بردار ہو جاتے ہیں کہ شیطان کے ان احکام سے ذرا بھی سرتابی نہیں کر سکتے، یہی معنی عبودیت کے ہیں، اہل انصاف سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص خدا کی نہ مان کر شیطان کی مانے تو کیا وہ ''عبداللہ'' سمجھا جائے گا؟ برخلاف ان کے جو خاص اللہ کے بندے ہیں ان پر شیطان کا افسوں نہیں چل سکتا، وہ جانتے ہیں کہ خدا ہی پرورش کرنے والا ہے اگر غذا کی وجہ سے طاقت آتی ہے تو اس میں طاقت دینے والا بھی خدا ہی ہے، اور اگر کوئی پرورش کرتا ہے تو اس کو متوجہ کرنے والا بھی خدا ہی ہے، اور اگر بادشاہ کی طرف سے تمدن قائم ہے تو وہ ظلی طور پر حاکم ہے اصل

مالکؔ الملک وہی خدائے تعالی ہے،غرضکہ وہ وساوس شیطانی پر’’لاحول‘‘پڑھ کران کو دور کردیتے ہیں وہ خدا ہی کو معبود اور قابل اطاعت سمجھتے ہیں ،خدا کے مقابلے میں شیطان کی اطاعت کوکفر جانتے ہیں، ہرحال میں ان کی توجہ خداہی کی طرف ہوتی ہےاور ہر وقت تقرب الٰہی ان کو حاصل رہتاہے ،اور شیطان جتنا ان کو اس بارگاہ سے دور کرنا چاہتاہے وہ نزدیک ہوتے جاتے ہیں،اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی ہے کہ انہوں نے تسلیم کرلیاہے کہ خدائے تعالی ہی سب آدمیوں کا بلکہ کل عالم کا رب اور مالک ہے یہی مستحکم اعتقاد ان کا ایک محکم قلعہ ہےجس کے اندر جانے کا راستہ ہی شیطان کونہیں مل سکتا ۔

یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ارشاد ہوا ،یعنی وسوسہ انداز خناس کے شر سے پناہ مانگو! یہ نہیں ارشاد ہوا کہ اس کے وسوسہ کے شر سے پناہ مانگو،اس سے ظاہر ہے کہ سوائے وسوسہ اندازی کےاور بھی اس کےشر ہیں،اس لئے اس کی کل شرارتوں سے پناہ مانگنی چاہئے ،مثلاً ایک شرارت اس کی یہ ہے کہ کسی دوسرے کو ورغلا کر کوئی حرکت اس سے ایسی صادر کرادیتاہے کہ خواہ مخواہ آدمی کو غصہ آجائے ،اور غصہ کی حالت میں ایسے کام اس سے کرادیتاہے کہ دنیا وآخرت میں ذلت اورخرابی کے باعث ہوتے ہیں،چنانچہ اکثر دیکھا جاتاہے کہ احباب کے مجمعوں میں کمالِ خوشی سے باہم گفت وشنید ہورہی ہوتی ہے،ہنسی ہنسی میں کوئی نہ کوئی صاحبِ کمال صفائی سے ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ مخاطب کو ناگوار ہومگر اہل مجمع اس سے لطف اٹھاتے

ہیں اس بات کا اثر یہاں تک ہوتا ہے کہ سب وشتم بلکہ قتال وجدال تک نوبت پہونچ جاتی ہے، دراصل یہ شرارت اسی وسوسہ انداز کی ہے کہ دوستی کے پیرایہ میں دوسرے سے وہ بات کہلوائی اورادھر غصہ کی حالت میں اپنا کام کرگیا، غالباً یہی وجہ ہوگی جوصحیح حدیث میں وارد ہے جس کو منذریؒ نے کتاب الترغیب والترہیب میں نقل کیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے **لایبلغ العبد صریح الایمان حتی یدع المزاح والکذب** یعنی: خالص ایمان تک آدمی نہیں پہونچ سکتا جب تک کہ مزاح یعنی ٹھٹھہ دل لگی اور جھوٹ کو نہ چھوڑے۔

الوسواس

اس لفظ کے معنی ''وسوسہ انداز'' کے لئے جاتے ہیں، دراصل ''وسواس'' بالفتح اسم ہے اور بالکسر مصدر ''وسوسہ'' خفی آواز کو کہتے ہیں جو ہوا کی سنی جاتی ہے اور زیور کی آواز کو بھی کہتے ہیں، ہر چند وسوسہ دل میں ہوتا ہے جہاں کسی قسم کی آواز کا وجود نہیں مگر چونکہ وسوسہ میں باتیں ہوا کرتی ہیں اور باتوں کا تعلق آواز سے ہے اس لئے دل کی باتوں پر وسوسہ کا اطلاق کیا گیا ہے جس کے معنی خفی آواز کے ہیں، اور وسوسہ سے چونکہ پلٹ پلٹ کر دل میں آتے جاتے ہیں اس لئے لفظ وسواس میں بھی تکرار ہوئی تا کہ تکرار لفظی تکرار معنوی پر دلالت کرے۔

اکثر استعمال اس لفظ کا بری باتوں میں ہوتا ہے جو دل میں آتی ہیں، چنانچہ

’’وسوسہ شیطانی‘‘ کہا جاتا ہے، چونکہ شیطان ہمیشہ وسوسے ڈالتا رہتا ہےاور کوئی دم ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ وسوسہ نہ ڈالے یا اس کی فکر میں نہ ہواس وجہ سے اس پر وسواس کا اطلاق فرمایا گیا، جیسے زید عدل کہا جاتا ہے، یعنی وسوسے ڈالتے ڈالتے وہ ہمہ تن وسوسہ ہی بن گیا، چونکہ شیاطین کی تخلیق اسی لئے ہے کہ اسباب شقاوت وضلالت قائم کیا کریں ،اسی لئے وہ کبھی اس کام سے تھکتے نہیں، جیسا کہ قرآن شریف سے ثابت ہے۔

تصرفِ شیطان اور نفس:

اب کہئے کہ وسوسہ انداز جو پیچھے پڑ گیا اور سوائے اِس کے اُس کو کوئی دوسرا کام ہے ہی نہیں تو اس کے شر سے بچنا کیسا مشکل کام ہے! نفس میں جتنی صفات رکھی گئی ہیں مثلاً شجاعت ،جبن ،سخاوت ،بخل ،صبر ،بے صبری ،حیاء ،بے حیائی،قناعت،حرص ،تکبر،تواضع ،رحم ،جور وجفا وغیرہ ان سب کے استعمال کے طریقے ایسے بتلاتا ہے کہ ذمیمہ اخلاقِ حمیدہ بھی ذمیمہ ہو جاتے ہیں، مثلاً صفت سخاوت کسی میں ہو تو ایسے مصروف پیش کر دیتا ہے کہ مال تلف ہو جائے اور بجائے نام آوری کے بدنامی اور بجائے ثواب کے عذاب حاصل ہو، مثلاً عیاشی وغیرہ ،اور اگر ایسے کاموں سے نفرت ہو تو خیال نام آوری اور ریاء ،سمعہ ،عجب وغیرہ پیش کر دیتا ہے جس سے سوائے اتلافِ مال کے آخرت میں کچھ فائدہ نہ ہو۔

چونکہ نفس میں قوائے شہوانیہ وغضبیہ موجود ہیں اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اپنی کل خواہشیں پوری کرے ،اور جتنی خواہشیں ہیں سب کو پوری کرنے کی اجازت بھی حق تعالی نے دی ہے ،مثلاً عورت کی خواہش ہوتو نکاح کی اجازت ہے ،اسی طرح کل خواہشوں کا حال ہے مگر شیطان جو آدمی کا دشمن ہے وہ نہیں چاہتا کہ حلال طریقہ سے خواہشیں پوری ہوں جس کی وجہ سے آدمی مستحق ثواب ہی ہوجائے ، بلکہ وہ مشورہ دیتا ہے کہ ناجائز طریقہ سے پوری کی جائیں تا کہ بجائے اس کے کہ مستحق ثواب ہو نافرمانی کے جرم میں مستحقِ عذاب بنادے۔

شیطان جس طرح بت پرستی پر لگاتا ہے ہوا پرستی پر بھی لگاتا ہے جو بت پرستی سے بھی بدتر ہے،جیسا کہ حدیث شریف میں ہے **قال النبی ﷺ ماتحت ظل سماء من الہ یعبد من دون اللہ اعظم عندا للہ من ھوا متبع (کذافی کنز العمال)** یعنی فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ: آسمان کے نیچے اللہ تعالی کے سوا جس معبود باطل کی بھی عبادت ہوتی ہے ان میں ہوائے متبع سے بدتر کوئی نہیں،''ہوائے متبع'' کا مطلب یہ ہے کہ خدااور رسول کے حکم کے خلاف بھی کوئی خواہش ہوتو آدمی اس خواہش کا متبع رہے اور حکم شرعی کا کچھ خیال نہ کرے،ہوا پرستی کے بت پرستی سے بدتر ہونے کی یہ وجہ ہے کہ بت پرستی بھی ہوا پرستی ہی کا ایک شعبہ ہے،جب حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ ہوا پرستی بت پرستی سے بھی بدتر ہے تو مسلمانوں کو اپنی خواہشوں کے پورا کرنے میں کس قدر احتیاط کرنے کی ضرورت ہے ! غرضکہ شیطان بذریعۂ ہوائے نفسانی آدمی کو

تباہ کر کے اپنی خواہشیں پوری کرتا ہے، اگر وساوس شیطانی نہ ہوں تو آدمی نہ دنیا کی پریشانی میں پڑے نہ آخرت میں مصیبت بھگتے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ شیطان ہمارا جانی دشمن ہے جیسا کہ خدائے تعالی اور نبی کریم ﷺ نے شیطان کی عداوت اور اس کی مکاریاں ظاہر کر کے مسلمانوں کو ہدایت فرمادی ہے کہ اس سے احتراز کرو اور اس کا کہا نہ مانو، اور اس کے کہنے کا طریقہ بھی معلوم کرادیا کہ دل میں جو بیہودہ خیالات آتے ہیں وہ وساوس شیطانی ہیں تو اب آدمی کو لازم ہے کہ علم کے ذریعہ سے معلوم کرے۔

کنزالعمال میں یہ حدیث وارد ہے **عن الاشعب بن قیس قال قال رسول اللہ ﷺ اشکرکم عند اللہ اشکرکم للناس** یعنی: فرمایا نبی کریم ﷺ نے: بڑا شکرگزار اللہ کا تم میں وہی شخص ہے جو لوگوں کا شکر زیادہ کرے، مطلب یہ کہ اپنے محسن کا شکر کرنا گویا خدائے تعالی کا شکر کرنا ہے، اگر محسن کا شکر زیادہ کروگے تو زیادہ شکر باری تعالی کا ہوجائے گا، کیونکہ محسن صرف واسطہ ہے جس کے ذریعہ سے خدائے تعالی کی نعمت پہونچی ہے، اگر وسائط بالکلیہ ساقط کردئے جائیں تو خدائے تعالی نے جو عالم اسباب میں مصلحتیں رکھی ہیں وہ فوت ہوجائیں گی اور ان کا فوت ہونا خدائے تعالی کو منظور نہیں اسی وجہ سے حدیث شریف میں وارد ہے کمافی کنز العمال: **عن ابن عباس قال قال النبی ﷺ من انعم علی اخیہ نعمۃ فلم یشکرھا فدعا علیہ یستجیب لہ**، یعنی جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو کوئی نعمت

عطاء کرے اور وہ اس کا شکریہ ادا نہ کرے اور محسن اس کی ناشکری کی وجہ سے اس کے حق میں بد دعاء کرے تو خدائے تعالی اس کی بد دعاء کو قبول فرمالیتا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ احسان کا شکر نہ کرنا محسن کے دل کو دکھانا ہے، اس دل آزاری کی سزا یہ مقرر ہوئی کہ وہ جو کچھ بارگاہ کبریائی میں اس کی نسبت عرض کرے گا وہ قبول ہو جائے گی، اس سے ظاہر ہے کہ ہر چند انعام وعطاء حق تعالی کی جانب سے ہے مگر جن وسائط وذرائع سے وہ نعمت حاصل ہوتی ہے وہ بھی قابل اعتبار ہیں۔

اگر وسائط نہ ہوں تو انتظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا جس کا جی چاہے گا کسی پر ظلم کر کے کہہ دے گا کہ میں نے کیا کیا وہ تو خدائے تعالی کا فعل تھا، اور ہر شخص بحسب اقتضائے شہواتِ نفسانیہ گناہوں کا مرتکب ہو کر کہے گا کہ میں بری الذمہ ہوں جو چاہا خدا نے کیا، یہ درست ہے کہ بغیر مشیت الٰہی کوئی کام نہیں ہوتا، مگر برا کام کرنے کے وقت آدمی کا مقصود صرف یہی ہوتا ہے کہ اپنی خواہش پوری کرے جس سے تلذذ خلافِ امر الٰہی نفس کو حاصل ہو، اس مقصود کو پورا کرنے کے بعد اگر یہ چاہے کہ خدائے تعالی پر الزام لگا کر آپ بری الذمہ ہو جائے تو اس سے پوچھا جائے گا کہ برا کام تو تم نے کیا اس میں فعل الٰہی کو کیا دخل؟ تو اس کا یہی جواب دے گا کہ یہ تو قرآن شریف سے ثابت ہے! تو ہم کہیں گے کہ جس طرح قرآن شریف سے وہ ثابت ہے یہ بھی ثابت ہے کہ برے کاموں سے خدائے تعالی نے منع فرمایا ہے اور اس کی سزا مقرر فرمائی ہے، اگر قرآن شریف اس قابل ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے تو اس کے کل احکام پر ایمان لانا چاہیئے

،اس کے کیا معنی کہ اپنے مطلب کی آیتوں پر ایمان لا کر استدلال میں پیش کریں اور جن کا اثر نفسانی خواہشوں پر پڑتا ہے ان کو نظرانداز کردیں ،اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوائے آیاتِ مشیت الٰہی کے دوسری آیات پر ایمان ہی نہیں ، جو شخص بعض آیات پر ایمان لائے اور بعض آیات پر ایمان نہ لائے تو اس بارے میں حق تعالیٰ فرماتا ہے اَفَتُؤمِنُوْنَ بِبَعْضِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰی اَشَدِّ الْعَذَابِ یعنی: کیا تم بعض آیات پر ایمان لاتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے! تو ایسے لوگوں کو جزا یہی ہے کہ دنیا میں رسوا ہوں اور آخرت میں سخت عذاب میں ڈالے جائیں۔

الحاصل ایمان کا مقتضی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے سب پر ایمان لائیں اور یہ نہ کہیں کہ یہ بات فلاں آیات کے خلاف ہے، بلکہ ایسے مواقع پر یہ خیال کریں کہ ہر بات خدائے تعالیٰ کی قابل تسلیم ہے، اگر اس کی حقیقت ہمیں معلوم نہ ہو تو ہمیں اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہمارا کام بقدر استطاعت عمل کرنا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے المؤمن کالجمل الانف حیثما انقید (او کما قال ﷺ) یعنی: مسلمان کی مثل اس اونٹ کی سی ہے جس کے نکیل لگی ہوئی ہو اس کا حال یہی ہے کہ جدھر کھینچیں ادھر مطیع و منقاد و فرماں بردار ہو کر چلا جاتا ہے، اگر یہ بات حاصل نہ ہو تو سمجھا جائے گا کہ وہ سرکش ہے، پھر خدائے تعالیٰ کے مقابلے میں کس کی سرکشی چل سکتی ہے؟ الغرض مسئلہ تقدیر و مشیت پیش کر کے گناہوں پر جرأت کرنا مسلمان کا کام نہیں۔

مروی ہے کہ شیطان نے بارگاہ کبریائی میں عرض کی کہ مجھ سے جو معصیت ہوئی وہ بحسبِ تقدیر تھی تو پھر یہ لعنت کیوں کی گئی؟ ارشاد ہوا کہ تو نے جس وقت نافرمانی کی کیا جانتا تھا کہ وہ تقدیر میں ہے؟ کہا نہیں! ارشاد ہوا کہ اسی کی سزا ہے جو تو ملعون ہوا، فی الحقیقت جس وقت اس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اس وقت حسد اور تکبر اس پر اس قدر غالب تھا کہ تقدیر کا خیال بھی اس کو نہ آیا ہوگا، ورنہ صاف کہہ دیتا کہ الٰہی تو نے میری تقدیر میں مخالفت لکھی ہے اس لئے میں سجدہ نہیں کرتا، بلکہ بجائے اس کے اس نے یہ کہا کہ میں ہرگز سجدہ نہ کروں گا کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا جو لطیف ہے اور ان کو مٹی سے جو کثیف ہے اور لطیف کا کثیف کے روبرو سر جھکانا عقلاً خلاف وضع ہے غرضکہ اپنی وضعداری اس وقت اس کے پیش نظر تھی۔

اسی طرح ہر گناہ کے وقت ایک خیال متمکن رہتا ہے جس کی وجہ سے آدمی مرتکبِ گناہ ہوتا ہے اور بعد گناہ اگر تقدیر اور مشیت وغیرہ کے مسئلہ میں استدلال کرے تو وہی جواب ہوگا جو شیطان کو دیا گیا تھا۔

خوفِ الٰہی:

حق تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ یعنی خدائے تعالیٰ سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علماء ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ جہلاء کو خدائے تعالیٰ

کا کچھ خوف نہیں، اس آیت شریفہ کی تصدیق کے بعد یہ یقین ہوتا ہے کہ جو لوگ تمامی درسی کتابیں پڑھ کر علماء مشہور ہوتے ہیں اگر ان کو خوف خدا نہ ہو تو ان کو ''علماء'' کہنا بے موقع ہوگا، کیونکہ کتابیں پڑھنا اور بات ہے اور ''علم'' کچھ اور ہی چیز ہے، یورپ میں اکثر یہود و نصاری علوم عربیہ میں ماہر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے فاضل کہلاتے ہیں مگر دین اسلام کی رو سے ان کو علماء نہیں کہہ سکتے، اسی طرح اہل اسلام بھی اگر تحصیل کرلیں اور ان میں خوف خدا نہ ہو تو اس آیت شریفہ کی رو سے ان کو عالم کہنا درست نہ ہوگا، دراصل علم اس کیفیت قلبیہ کا نام ہے جو ظن سے متجاوز ہو کر حد یقین میں داخل ہوگئی ہو۔

اب یہاں یہ دیکھنا چاہئے کہ دین میں کونسی چیزوں کا علم معتبر ہے اور اس علم کا معلوم کیا ہے؟ کیونکہ عالم میں بے انتہا چیزیں ایسی ہیں جن کا علم دین اسلام کے لحاظ سے ضروری نہیں، تمام آیات و احادیث سے ثابت ہے کہ آدمی کو اللہ تعالی کی ذات وصفات اور اس کے احکام واخبار کا علم ضروری ہے، یعنی جس طرح خدائے تعالی نے خبر دی ہے اس کا یقین کرلے اور کیفیت یقین حاصل ہو تو وہ علم ہوگا۔

جب آدمی اس بات کو جان لے گا کہ خدائے تعالی کے صفات میں قہاریت بھی ایک صفت ہے اور اسی صفت کا یہ اثر ہے کہ حق تعالی نے برے کاموں سے منع فرمایا ،اور جو لوگ ان کے مرتکب ہوں ان کے لئے دوسرے عالم میں ایک بڑا قید خانہ تیار کیا جس میں ہر قسم کی اذیتیں ہیں تو اس علم کے بعد اس سے گناہ اول تو صادر ہی نہ ہوگا اور

اگر ہو گیا تو وہ توبہ کر لے گا، غرضکہ اس علم کے بعد اس کو خوف الٰہی ضرور ہو گا اور جس کو یہ علم ہی نہ ہو تو اس کو خوف بھی نہ ہو گا، الحاصل جس کسی کو صفت قہاریت اور اس کے آثار کا علم ہو گا ممکن نہیں کہ وہ بے خوف ہو، البتہ مدارج علم متفاوت ہوتے ہیں اس لئے خوف کے مدارج بھی متفاوت ہوں گے، جس کو کمال درجہ کا علم و یقین ہو گا اس کو خوف بھی اسی درجہ کا ہو گا، اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں اَنا اَخشاکم اللہ یعنی میں تم سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ سے خوف و خشیت رکھتا ہوں۔

شفاء قاضی عیاض میں یہ روایت ہے کہ عبداللہ بن سخیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک روز آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ نماز اداء فرما رہے تھے، آپ کے سینۂ مبارک سے ایسی آواز سنائی دیتی تھی جیسے دیگ کے جوش کی آواز ہوتی ہے، مطلب یہ کہ آپ خشیت الٰہی سے گریہ کو ضبط فرماتے تھے مگر اندرونی اثر اس کا ظاہر ہو ہی جاتا تھا۔

شفاء میں ترمذی سے یہ روایت نقل کی ہے: عن ابی ذر قال قال رسول اللہ ﷺ : واللہ لو تعلمون مااعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیراً وماتلذذتم با لنساء علی الفروش ولخرجتم الی الصعدات تجارون الی اللہ لوددت انی شجرۃ تعضد یعنی ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے : جو میں جانتا ہوں اگر تم لوگ جانتے ہوتے تو بہت کم ہنستے اور بہت زیادہ روتے اور بستروں پر عورتوں سے لذت حاصل نہ کرتے اور خدا کی طرف فریاد و فغاں کرتے ہوئے

راستوں کی طرف نکل جاتے، مجھے آرزو آتی ہے کہ کاش میں ایک درخت ہوتا جو جڑ سے اکھاڑ دیا جاتا، چونکہ آنحضرت ﷺ کی شان نہایت ارفع ہے اس لئے آخری جملہ یعنی **لوددت انی شجرۃ تعضد** کو محدثین نے ابوذرؓ کا کلام قرار دیا ہے، ممکن ہے کہ فی الواقع یہی بات ہو مگر ظاہراً بلحاظ سیاق حدیث شریف ہی کا جزو معلوم ہوتا ہے کیونکہ کوئی لفظ ایسا نہیں کہ جس سے معلوم ہو کہ وہ ابوذرؓ کا کلام ہے، اگر آنحضرت ﷺ کا کلام ہو تو بھی چنداں بعید نہیں اسلئے کہ حالتِ خوف جب دل پر طاری ہوتی ہے تو بیخودانہ ایسی باتیں نکل جاتی ہیں، اور اس میں کوئی کسر شان بھی نہیں، کیونکہ جب دوسری قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس وقت اسی کے اقتضاء کے موافق کلام صادر ہوتے ہیں۔

اہل تصوف جن پر بحسبِ مقامات حالات طاری ہوتے رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب کسی مقام سے متعلق کوئی حالت طاری ہوتی ہے اس وقت کیسی بے احتیاطی ہو جاتی ہے، یہی بے اختیاری اس حالت کے مناسب کلام پر مجبور کرتی ہے، دوسری احادیث کثرت سے وارد ہیں جس سے حضرتؐ کی اصلی شان کا پتہ چلتا ہے کہ نہ وہ کسی نبی کو حاصل ہے نہ کسی فرشتہ کو، اور اس حدیث میں گو ظاہر بینوں کی نظر میں کسر شان معلوم ہوتی ہے مگر اس میں بھی حضرتؐ کی رفعت شان معلوم ہوتی ہے، کیونکہ مقام خوف بھی ایک اعلیٰ درجہ کا مقام ہے اور اس کا انتہائی درجہ عدم ہے جس کی طرف آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے، بہر حال مقام خوف کے آثار ولوازم اسی قسم کے ہوتے ہیں اور اسی پر منحصر نہیں ہر مقام کی بات جدا ہوتی ہے۔

جنگ بدر میں جب کفار کثرت سے باساز وسامان جنگ میں صف آرا ہوئے اور صحابہؓ تھوڑے اور بے سامانی کی حالت میں، یہ دیکھ کر اس وقت آنحضرت ﷺ پر ایک حالت طاری تھی بار بار عرض کرتے تھے کہ: الٰہی اگر ان مسلمانوں پر مشرک غالب ہو جائیں اور اس چھوٹی جماعت اہل ایمان کو تو ہلاک کردے گا تو روئے زمین پر تیری عبادت موقوف ہو جائے گی، یا اللہ مجھے رسوا مت فرمانا! اللہ مجھ سے جو تو نے وعدہ فرمایا ہے وہ پورا کر، حضرتؐ قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر ہاتھ اٹھا اٹھا کر بار بار اس قسم کی دعائیں فرماتے تھے یہاں تک کہ چادر مبارک دوش مبارک پر سے گر گئی، ابوبکرؓ نے چادر دوش مبارک پر اڑھا کر کہا یا رسول اللہ ﷺ بس کیجئے امید ہے کہ قریب میں حق تعالی اپنا وعدہ پورا فرمائے گا، کیا کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ صدیق اکبرؓ کا ایمان آنحضرت ﷺ کے یقین سے بڑھا ہوا تھا اور معاذ اللہ آنحضرت ﷺ کو یقین نہ تھا جس کی وجہ سے اس قسم کی دعائیں کرنے کی ضرورت ہوئی؟ ہرگز نہیں! کجا یقین ابوبکرؓ اور کجا یقین سید المرسلین و باعثِ ایجاد کون ومکاں! مگر بات یہ ہے کہ بڑوں کی بات بھی بڑی ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ کو اس وقت مشاہدۂ ذات کبریائی تھا جو تمام عالم سے غنی ہے **کما قال تعالی وَاللّٰہُ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ** وہاں مسلمان تو کیا سارا عالم تباہ ہو جائے تو کچھ پرواہ نہیں، اسی ذات پاک کا نام ہادی بھی ہے اور مضل بھی، اسی مقام میں ارشاد ہے اگر سارا عالم جنت میں چلا جائے تو کچھ پرواہ نہیں اور دوزخ میں جائے تو بھی کچھ پرواہ نہیں، بہر حال بارگاہ ربانی میں نہ جمال کو ترجیح ہے نہ جلال کو، چونکہ

آنحضرت ﷺ مظہر شان جمالی تھے اس وجہ سے آپ کو کمال درجہ کی تشویش تھی کہ کہیں شان جلالی کا ظہور نہ ہو جائے اور یہ تشویش یہاں تک بڑھی کہ گویا بیخودی کی حالت طاری کر دی۔

سیرۃ نبویہ میں شیخ دحلان نے علماء کا قول نقل کیا ہے کہ صدیق اکبرؓ مقام رجاء میں تھے اور آنحضرت ﷺ مقام خوف میں، بہرحال جس حالت کا پورا وجود ہوتا ہے دوسرے کل خیالات مضمحل ہو جاتے ہیں، حق تعالیٰ فرماتا ہے حَتّٰـــی اِذَا سْتَیْـــاَسَ الـرُّسُـلُ وَظَنُّوْ اَانَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا جَاءَ ھُمْ نَصْرُنَا یعنی: یعنی یہاں تک (ڈھیل دی تھی) کہ رسول بھی ناامید ہو چلے تھے اور خیال کرنے لگے تھے کہ ان سے غلط وعدے کئے گئے تھے تب ان کے پاس ہماری مدد پہنچی، اس میں شک نہیں کہ انبیاء کو جو یقین اپنی نبوت کا اور وعدہ ہائے الٰہی کے پورے ہونے کا ہوتا ہے وہ ایسا نہیں ہوتا کہ کسی وجہ سے زائل ہو سکے، مگر جب امداد ہی میں بہت تاخیر ہوئی اور یہاں تک نوبت پہونچی کہ شدہ شدہ یاس کی طاری ہوگئی تو اس وقت بمقتضائے بشریت یہ خیال پیدا ہوا کہ وعدہائے امداد جھوٹے تو نہ تھے جو کسی واسطہ نے اپنی جانب سے کہہ دیا!

حالت یاس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ ایسے خیالات پیدا ہوں کیونکہ جو حالت آدمی پر غالب ہوتی ہے اس کے آثار کا ظہور میں آنا ضروری ہے، دیکھئے کسی قسم کی حالت کا جب غلبہ ہو جاتا ہے تو آدمی خودکشی کر لیتا ہے حالانکہ مقتضائے فطرت انسانی ہے کہ اپنی جان بچانے کی تدبیریں کرے، مگر غلبۂ حال اس مقتضائے فطرت پر بھی غالب

آجاتا ہے شرع شریف نے بھی اس حالت کی رعایت رکھی ہے، چنانچہ حالتِ اضطرار میں مردار کھانا درست ہوجاتا ہے مگر سای حد تک کہ جس سے وہ حالت رفع ہو، اسی وجہ سے چند لقموں کے بعد جب وہ حالت باقی نہ رہے تو مردار جو ضرورتاً حلال ہوگیا تھا پھر مردار ہوجائے گا، یہیں سے قیاس ہوسکتا ہے کہ بزرگان دین پر جب سماع وغیرہ میں سچی حالتِ وجد طاری ہوتی ہے تو بعض کلمات وحرکات ان سے ایسے صادر ہوتے ہیں جو شرعاً وعقلاً ناجائز ہوتے ہیں؟ مگر چونکہ وہ سچی حالت ہوتی ہے اس لئے وہ معذور سمجھے جاتے ہیں۔

الحاصل جب اسباب کسی حالت کے جمع ہوجائیں تو وہ حالت وکیفیت ضرور پیدا ہوجائے گی، مثلاً خبر متواتر اور قرائن سے ثابت ہوجائے کہ فلاں مقام میں شیر ہے اور شیر کا مقابلہ بھی ہوجائے تو حالتِ خوف ضرور طاری ہوگی، ہاں یہ بات اور ہے کہ جوانمرد شخص ہو اور اس کو اپنے اسلحہ اور قوت ارادی پر اعتماد ہو کہ شیر کو مارلوں گا تو اس کو خوف نہ ہوگا، اب کہئے کہ کون ایسا ہوسکتا ہے کہ اپنی ذاتی قوت اور طاقت پر اس کو اس درجہ گھمنڈ ہو کہ خدائے تعالی کے مقابلہ میں سر بر ہو سکے؟ اسی وجہ سے تمام انبیاء اور اولیاء جب خدائے تعالی کی صفت قہاریت پر نظر ڈالتے ہیں تو بے اختیار ان پر حالتِ خوف طاری ہوجاتی ہے، مگر کیونکہ ان کا ایمان اس پر کامل ہوتا ہے اور پھر جب صفات کمالیہ ان کے پیش نظر ہوجاتی ہیں تو رجاء کی کیفیت ان پر طاری ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے علماء نے تصریح کی ہے کہ الایمان بین الخوف والرجاء۔

دراصل کلام الٰہی بھی اس کی تعلیم فرماتا ہے چنانچہ ارشاد ہے: انـه لاییـأس من روح اللـه الاالقوم الکافرون یعنی خدائے تعالی کی رحمت سے ناامید ہونے والے سوائے کافروں کے اور کوئی نہیں ،اس سے ظاہر ہے کہ خدائے تعالی کی رحمت کی امید رکھنا ضروری ہے،اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے فلایـأمن مکـر اللـه الا القوم الـخـاسـرون یعنی خدائے تعالی کے مکر سے بےفکر ہوجانے والے نقصان اٹھانے والوں کے سوا اور کوئی نہیں جس سے ظاہر ہے کہ مکر الٰہی سے خوف رکھنا ضروری ہے، کنز العمال میں روایت ہے قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم : من زعم انه فی الجنة فهو فی الـنـار یعنی جو شخص کہے کہ میں جنتی ہوں تو سمجھ جاؤ کہ وہ دوزخی ہے، وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کا ایمان آیت شریفہ فلایأمن مکر ا لله پر نہیں ہے،اور جس کا ایمان پورے قرآن شریف پر نہ ہو اس کا دوزخی ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے، چنانچہ ارشاد ہے افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فماجزاء من یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیوة الدنیا ویوم القیامة یردون الی اشد العذاب یعنی کچھ آیتوں پر ایمان لاتے ہو اور کچھ پر نہیں ایمان لاتے ،ایسے لوگوں کی جزاء یہی ہے کہ دنیا میں رسوا ہوں اور قیامت میں سخت عذاب میں ڈالے جائیں۔

اب اگر اس پر بھی کوئی کسی قسم کا خیال پیش نظر رکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ میں جنتی ہوں جس کا لازمہ یہ ہے کہ خدائے تعالی نے جن کاموں کے کرنے کا حکم فرمایا ہے وہ نہ کرے گا اور جن کاموں کے کرنے سے منع فرمایا ہے وہ کیا کرے گا تو اس پر یہ آیت

صادق آجائے گی أفمن اتخذ الهه هواه واضله الله علی علم جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی خواہش کو معبود بنالیا اور خدائے تعالیٰ نے باوجود اس کے علم کے اس کو گمراہ کردیا، خواہش کو معبود بنانے کی یہی صورت ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ارشاد پر عمل نہ کرکے اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے، پھر ایسے شخص کا ٹھکانا حسب اصول عقلیہ وشرعیہ دوزخ ہی نہ ہو تو کیا ہو۔

غرضکہ جس طرح خواہشات نفسانی میں اپنا تصرف کرتا ہے اسی طرح تمام اخلاق حمیدہ وذمیمہ میں اسی قسم کے تصرف کرتا ہے جس کا حال کتب اخلاق میں مصرح ہے، احیاء العلوم کی کتاب الغرور یا اس کا ترجمہ ''مذاق العارفین'' دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ کیسے کیسے شیطان کے دھوکے ہیں جن میں وسوسوں کے ذریعہ سے کامیاب ہوتا ہے اسی طرح جسمانی لذتوں سے متعلق وسوسے کے ذریعہ سے کامیاب ہوتا ہے اسی طرح جسمانی لذتوں سے متعلق وسوسے ڈالتا ہے اور آنکھ، کان، ناک، منہ، ہاتھ پاؤں وغیرہ سے برے کام کروا کر چھوڑتا ہے، اگر اس بیان کی تفصیل لکھی جائے تو ایک بڑی کتاب ہوجائے گی، مگر بمصداق العاقل تكفيه الاشارة کے یہ اجمال بھی کافی ہوسکتا ہے ، بشرطیکہ ہر ایک امر میں غور وفکر سے کام لیا جائے، غرضکہ وساوس شیطانی بے انتہا ہیں بغیر اللہ تعالیٰ کی پناہ کے ممکن نہیں کہ آدمی اس کے شر سے بچ سکے۔

لذت گناہ:

جو لوگ پناہ الٰہی میں پورے طور سے آ کر شیطان کی وسوسہ اندازی اور مکروتزویر سے بمقتضائے بشریت گناہ کے مرتکب ہو بھی جاتے ہیں تو ان کو گناہ کچھ ضرر نہیں دیتا، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ گناہ سے جو لذت حاصل ہوئی وہ ایک نعمت الٰہی تھی جس کی تخلیق میں سوائے خدائے تعالیٰ کے کسی کو دخل نہیں، اگر بجائے لذت کے اس میں مصیبت ہوتی تو ممکن نہیں کہ اس کا ارتکاب ہوسکتا، مثلاً دیکھئے کیسے ہی لذیذ کھانے مہیا ہوں اگر منہ میں چھالے پڑ جائیں تو بجائے لذت کے ان کھانوں میں اذیت ہوتی ہے علیٰ ہذا القیاس ہر ایک عضو جس میں حس کو لذت کا احساس ہوتا ہے اس میں کوئی آفت آجائے تو جس کام سے التذاذ ہوتا ہے وہی کام اس کے حق میں عذاب ہو جاتا ہے غرض لذت دینا خدائے تعالیٰ ہی کا کام ہے۔

اعلیٰ درجہ کا شکر:

صحیح حدیث میں وارد ہے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰؑ پر وحی نازل کی کہ: اے موسیٰ تم میرا ایسا شکر کرو جیسا کہ شکر کرنے کا حق ہے! انہوں نے عرض کی: یا اللہ کس کو یہ طاقت ہے کہ ایسا شکر ادا کر سکے؟ ارشاد ہوا اے موسیٰ جب تم سمجھ لو گے کہ نعمت میری طرف سے ہے تو یہی اعلیٰ درجہ کا شکر ہو جائے گا۔

خلق افعال وارتکاب افعال میں فرق:

اگر چہ یہ جائز نہیں کہ گناہ کرکے آدمی اللہ تعالی کا شکر کرے مگر یہ اعتقاد رکھنا بھی لازمی تھا کہ جتنے افعال بندے سے صادر ہوتے ہیں سب کا خالق خدائے تعالی ہے ،بخلاف اس کے اگر یہ اعتقاد کرے کہ شیطان اس فعل کا خالق ہے اس وجہ سے کہ یہ شیطانی فعل تھا تو یہ اعتقاد حد کفر کو پہونچ جائے گا، پھر اس اعتقاد کے موافق جب اس فعل میں خدائے تعالی کے خالق ہونے کا خیال کیا جائے تو بحسب شرع شریف اس پر کوئی الزام عائد نہیں ہوسکتا، بشرطیکہ اس کے ساتھ یہ اعتقاد بھی ہو کہ اس فعل سے خدائے تعالی نے منع فرمایا ہے اور اس کا مرتکب مستحق عقاب ہے، کیونکہ خلق افعال اور ارتکاب افعال میں بین فرق ہے، اس کا تعلق خدائے تعالی سے ہے اور اس کا تعلق بندے سے ،اس کا حسن اس وجہ سے ہے کہ وہ فعل خاص خدائے تعالی کا پیدا کیا ہوا ہے، اور قبح اس وجہ سے کہ خدائے تعالی نے اس ارتکاب سے منع فرمایا ہے۔

بری چیز کی تخلیق بری نہیں:

خدائے تعالی نے جس چیز کو پیدا کیا خواہ وہ اچھی سمجھی جائے یا بری، اس کا پیدا کرنا برا نہیں ہوسکتا، بلکہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کو خدائے تعالی نے پیدا کیا وہ بری

نہیں ہوسکتی کیونکہ برائی اور بھلائی باعتبار آثار ولوازم کے ہوا کرتی ہے نفس شئے کو اس سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے کہ یہ امور اس کی ذات سے خارج ہیں، مثلاً دیکھئے کہ آگ خدائے تعالی کی مخلوق ہے اس کو نہ بری کہنے کی ضرورت ہے نہ اچھی کہنے کی بلکہ صرف وہ آگ ہے اس کے بعد اگر وہ کسی کو جلا دے تو ضرور کہے گا کہ کیا ہی بری چیز ہے اور اگر کھانا پکا دے تو اعلی درجے کی نعمت سمجھے گا اسی پر تمام چیزوں کو قیاس کر لیجئے، سانپ اس وجہ سے برا سمجھا جاتا ہے کہ آدمی اس کے زہر سے ہلاک ہوجاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہا گر جذامی کو ڈس لے تو اس کو صحت ہوجاتی ہے، اس صورت میں جذامی اس کا عاشق ہوگا اور تلاش کر کے اس سے ملنا چاہے گا، اس سے ظاہر ہے کہ کوئی چیز فی حد ذاتہ بری نہیں بلکہ موجود ہونے کی حیثیت سے اچھی ہے اگر کوئی بری چیز ہے تو عدم ہے۔

یہ اشیاء کا حال تھا اسی طرح افعال کا حال بھی ہے کہ موجود ہونے کی حیثیت سے کل افعال اچھے ہیں اور نیز اس وجہ سے کہ خاص خدائے تعالی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، جس کی حکمت کا یہ مقتضی نہیں ہوسکتا کہ دیدہ ودانستہ بری چیز کو پیدا کرے، غرضکہ فعل بھی فی نفسہ ایک موجود چیز ہے جس کی برائی یا بھلائی باعتبار آثار ولوازم کے ہوگی، جتنے برے کام ہیں چونکہ ان کے لوازم برے ہیں اس وجہ سے وہ برے ہیں، ورنہ ان کو برے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں، بسا اوقات اچھے کام بھی کسی وجہ سے برے ہوجاتے ہیں اور برے کام اچھے، مثلاً کثرت عبادت سے بہتر کوئی چیز نہیں مگر ریاء وغیرہ کی وجہ سے وہ بری ہوجاتی ہے:

کلیددر دوزخ است آں نماز

کہ از بہرمردم گزاری دراز

لیجئے نماز جو باعث دخول جنت ہے وہ دوزخ کی کنجی ہوئی جارہی ہے!!

حضرت عمرؓ جب آنحضرت ﷺ کے قتل کے ارادے سے نکلے تھے تب ان کا اس ارادے سے راہ طے کرنا کیسا فعل تھا ؟ نبی ﷺ کے قتل سے بدتر کوئی فعل نہیں ہوسکتا،مگر جب اس فعل کے ذریعہ سے نبی کریم ﷺ تک پہونچ کر مشرف باسلام ہوئے تو ایسے فعل کو جو ابدالآباد تک فضیلت کا باعث ہوا گر تمام اعمال حسنہ سے اچھا کہا جائے تو بے موقعہ نہ ہوگا، دیکھئے یہ ایک ہی فعل ہے یعنی چل کر راہ طے کرنا ایک اعتبار سے بدترین افعال تھا اور ایک اعتبار سے بہترین افعال ہوا،غرضکہ نفس فعل نہ برا ہے نہ اچھا، بلکہ باعتبار وجود کے اس کو اچھا بھی کہہ سکتے ہیں جب یہ معلوم ہوگیا کہ افعال میں برائی اور بھلائی بحسب اعتبارات ہے تو اس اعتبار سے کہ آدمی کو جس فعل میں تلذذ ہوا سے نعمت کہتے میں کوئی تامل نہیں، یہ صحیح ہے کہ شرعاً ممنوع ہونے کی وجہ سے اس کا نتیجہ برا ہوگا اس اعتبار سے اس کو برا کہنا بھی ضروری ہے،مگر ارتکاب کے وقت اس میں وہ برائی موجود نہیں جو آئندہ جزاء کے وقت ہونے والی ہے،اس لحاظ سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ فعل تو تلذذ کی وجہ سے نعمت تھا مگر اس کی جزاء بری ہے جس سے اذیت حاصل ہوگی جس کا مطلب یہی ہوا کہ فعل فی نفسہ اچھا بلکہ ایک نعمت تھا جو مستوجب شکر ہے اگر مدارج میں خلط نہ کیا جائے تو نفس فعل قابلِ شکر ہے اور اسکی جزاء قابلِ اجتناب۔

جولوگ پناہ الٰہی میں آجاتے ہیں اگران سے کوئی گناہ صادر ہو جاتا ہے تو اس لحاظ سے کہ نعمت ہے شکر الٰہی دل سے بجالاتے ہیں اوراس کے ساتھ ہی یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ بے شک ہم سے گناہ صادر ہوا جس کا انجام برا ہے اوراس کے شر سے پناہ مانگتے ہیں۔

سیدالاستغفار کے معنی:

چنانچہ یہی بات سیدالاستغفار سے ظاہر ہے جس کے یہ الفاظ صحیح احادیث میں وارد ہیں اللھم انت ربی لاالہ الا انت خلقتنی واناعبدک وابن عبدک وابن امتک ناصیتی بیدک وانا علی عھدک ووعدک مااستطعت اعوذبک من ماصنعت ابوء لک بنعمتک علی وابوء بذنبی فاغفرلی ذنوبی فانہ لایغفرالذنوب الا انت یعنی: یااللہ تو میرارب ہے کوئی معبود برحق تیرے سوانہیں تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں اور تیرے بندہ کا بیٹا اور تیری بندی کا بیٹا ہوں، اور تیرے عہد اوروعدہ پر قائم ہوں جہاں تک مجھ سے ہوسکتا ہے جو برا کام میں نے کیا اس کے شر سے میں تیری پناہ میں آتا ہوں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھ پر تیری نعمت ہے اوراپنے گناہ کا بھی اقرار کرتا ہوں تو خدایا میرے گناہ بخش دے کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کونہیں بخشتا۔

دیکھئے نعمت کا اقرار کرنا اعلی درجہ کا شکر ہے جیسا کہ حدیث شریف سے ابھی

معلوم ہوا، اور اس موقہ پر سوا اس تلذذ گناہ کے اور کونسی نعمت تھی! پھر اس کے ساتھ ہی گناہ کا اقرار بھی ہوگیا اور اس کے شر سے پناہ مانگی گئی، یہ بات معلوم ہے کہ آدمی کا نفس ہمیشہ اپنی خواہشوں کو پوری کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے، خواہ جائز طریقہ سے ہو یا ناجائز ، اور شیطان ناجائز طریقوں سے پوری کرنے کی تدبیریں بتاتا ہے جب اس قسم کی بات آدمی کو معلوم ہوجاتی ہے تو شیطان کو گناہوں پر جرأت دلانے کا موقعہ مل جاتا ہے کہ جب وہ خدائے تعالی کی طرف سے نعمت ہے تو نہایت شکر گزاری سے اس کو حاصل کرنا چاہئے! اس قسم کے دھوکہ میں وہی شخص آجاتا ہے جس کا ایمان ضعیف ہو یا برائے نام مسلمانوں میں شریک ہے، کامل الایمان ایسے وسوسوں پر ''لاحول'' پڑھتا ہے کیونکہ وہ یقیناً جانتا ہے کہ خدائے تعالی گناہوں سے ناراض ہوتا ہے اور ان کی سزائیں مقرر کی ہیں، اسی وجہ سے اگر گناہ اتفاقاً صادر ہوجائے تو نہایت عجز والحاح سے بارگاہ کبریائی میں عرض کرتا ہے کہ الہی میں اقرار کرتا ہوں کہ گناہ مجھ سے صادر ہوگیا اب تیرے سوا کوئی اس کو بخشنے والا نہیں اس کے شر سے میں تیری پناہ میں آتا ہوں میرے گناہ کو بخشدے، اگر ایسا نہ کرے تو گناہوں کا سلسلہ قائم ہوجاتا ہے اور دل سیاہ اور زنگ آلود ہوجاتا ہے۔

چنانچہ کنز العمال میں روایت ہے کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ: بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑجاتا ہے اگر گناہ کو اس نے چھوڑ دیا اور استغفار اور توبہ کی تو دل کی صیقل ہوجاتی ہے، اور اگر پھر کیا تو وہ دھبہ بڑھ

جاتاہےاوراس کے دل کوگھیر لیتاہے،اسی کانام ’’ران‘‘ ہےجس کوخدائےتعالی نے ذکر فرمایاہے کلابل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔

الخناس

الخناس: ہٹنےاور چھپنےوالا

احادیث میں وارد ہے کہ شیطان اپنی چونچ (سونڈھ) آدمی کے دل پر رکھ کروسوسےڈالتاہے،اور جب وہ اللہ تعالی کا ذکر کرنے لگتاہےتو وہ ہٹ جاتاہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جس دل میں یاد الٰہی ہو شیطان کا اس پر تسلط نہیں ہوسکتا اسی وجہ سے اولیاء اللہ گناہوں سے محفوظ ہیں اور انبیاء معصوم، کیونکہ ان حضرات کے دل میں ہر وقت یاد الٰہی رہتی ہے یہاں تک کہ دنیوی کاموں میں بھی ان کوغفلت نہیں ہوتی، چنانچہ ہم نے مقاصدالاسلام کے کسی حصہ میں اس کا بتفصیل بیان کیاہے کہ ہر کام میں ایک خاص قسم کا وہ ذکر کیا کرتے ہیں، حدیث شریف میں وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ: لوگوڈرتے رہو اور شیطان سے بچو، کیونکہ وہ تم کو آزماتاہے کہ تم میں کون شخص عمل میں اچھاہے، مقصوداس سے یہ ہے کہ حق تعالی نے شیطان سےفرمایاہے کہ ان عبادی لیس لک علیھم سلطان یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہوسکتا جب وہ وسوسے ڈالنے کا موقعہ نہیں پاتا یا وسوسے ڈالتاہے مگر اس کی کچھ نہیں چلتی تو سمجھ جاتاہے کہ یہ انہیں لوگوں میں سے ہیں جن پر اپنا تسلط نہیں

اس وقت دوسری تدابیر میں مصروف ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت غوث الثقلینؒ کے حال میں لکھا ہے کہ آپ نے اوائل میں بڑے بڑے مجاہدے فرمائے ،ایک رات ذکر الٰہی میں مشغول تھے کہ یکبارگی آسمان پر روشنی نمایاں ہوئی جس سے آفاق روشن ہو گئے آپ متحیر ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے غیب سے آواز آئی کہ اے عبدالقادر تم نے بہت عبادت کی اس کے معاوضہ میں ہم تمہیں یہ بدلہ دیتے ہیں کہ جن چیزوں کو اوروں پر حرام کیا تم پر حلال کر دیا! یہ سنتے ہی آپ نے لاحول پڑھی اس کے ساتھ ہی وہ روشنی مبدل بہ تاریکی ہوگئی اور آواز آئی کہ اے عبد القادر میں نے بہت سے لوگوں کو جو اس درجہ پر پہونچے تھے گمراہ کر دیا مگر آپ علم کی وجہ سے بچ گئے ، یہ ایک بیرونی تدبیر تھی غرضکہ شیطان بیرونی اور اندرونی تدابیر ہمیشہ کرتا اور موقعہ بے موقعہ آزماتا رہتا ہے اور آخری آزمائش اس کی موت کے قریب ہوتی ہے جس میں پورا کافر بنانے کی فکر کرتا ہے، چنانچہ حق تعالی فرماتا ہے **اذقال الشیطان للانسان اکفر فلما کفر قال انی بریء منک انی اخاف اللہ رب العالمین** یعنی: جب کہتا ہے شیطان انسان کو کہ کافر ہو جا! اگر وہ کافر ہو گیا تو کہتا ہے میں تجھ سے بری ہوں میں خدائے تعالی رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

’’اکام المرجان فی احکام الجان‘‘ میں ایک روایت نقل کی ہے کہ جب مسلمان شیطان کے فتنوں سے بچ کر حالت ایمانی پر مرتا ہے تو شیطان کو نہایت غم ہوتا ہے اور اس طرح روتا ہے کہ کوئی گھر والوں کے مرنے پر بھی ایسا نہیں روتا، اور اسی میں لکھا ہے کہ

امام احمد بن حنبلؒ نے موت کے قریب ''**لا بعد لا بعد**'' کہا جب انہیں افاقہ ہوا تو ان کے فرزند صالح نے پوچھا کہ آپ نے ''**لا بعد لا بعد** '' جو فرمایا وہ کیا بات تھی؟ فرمایا کہ شیطان نے میرے سر کے پاس آ کر مجھ سے کہا کہ اے احمد میں کچھ پوچھتا ہوں فتوی دیجئے! میں نے ''**لا بعد لا بعد**'' کہا یعنی اس وقت نہیں بعد دیکھا جائے گا، معلوم نہیں کہ کس قسم کا سوال اس نے سوچ رکھا تھا جس سے ایسے جلیل القدر امام کے ایمان کو سلب کرنے کی فکر تھی۔

اور اسی میں ابوداؤد کی حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعاء کیا کرتے تھے ''**واعوذ بک ان یتخبطنی الشیطان عند الموت** ''یعنی یا اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ موت کے قریب شیطان مجھے مخبوط بنادے، اگرچہ کہ یہ دعاء امت کی تعلیم کے واسطے تھی مگر اس سے صاف ظاہر ہے کہ شیطان موت کے قریب اپنا پورا زور لگاتا ہے۔

اور اسی کتاب میں صالح بن احمد بن حنبلؒ سے ایک روایت منقول ہے کہ جب فرشتے مسلمان کی روح آسمان پر لے جاتے ہیں تو وہاں کے فرشتے تعجب کرکے کہتے ہیں کہ اس شخص نے شیطان کے ہاتھ سے کس طرح نجات پائی؟! ابن جوزیؒ نے تعجب کی وجہ لکھی ہے کہ: شیطان کے فتنے کثرت سے ہیں اور دل کے پاس اس کا مقام ہے ، اور وہ ایسی ہی چیزوں کی طرف لے جاتا ہے جو آدمی کی خواہش کے مطابق ہوں، اور نفسانی خواہشیں ایسی بلا کی ہیں کہ ہاروت و ماروت جو فرشتے تھے جب خواہشیں انہیں

دی گئیں تو وہ اپنے کو بچا نہ سکے، تو انسان کس طرح اپنے آپ کو مکر شیطان سے بچا سکتا ہے! اوران امور کے لحاظ سے فرشتے تعجب کرتے ہیں کہ کس طرح اس نے اپنے آپ کو شیطان سے بچایا ہوگا، اب غور کیجئے کہ ایمان دار کو شیطان کے فتنوں سے کس قدر ڈرنا اور ہمیشہ پناہ مانگنا چاہئے۔

نفس وسوسہ کوئی بری چیز نہیں:

یہاں یہ بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ شیطان کی صرف وسوسہ اندازی سے کوئی نقصان نہیں اس لئے کہ وہ شیطان کا فعل ہے اس کی جزاء وہی بھگتے گا، صرف اس وسوسے کے دل میں پیدا ہونے سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دل نجس یا خراب ہو گیا کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ کوئی چیز اپنی ذات سے بری نہیں اگر فرض کیا جائے کہ عمر بھر برا وسوسہ دل میں رہے اور آدمی اس کو اچھا یا برا نہ سمجھے تو اس سے کوئی نقصان نہیں، ہاں اگر اس برے وسوسے کو اچھا سمجھے تو یہ سمجھنا جو اس کا فعل ہے قابل مؤاخذہ ہوگا اور برا سمجھے تو وہ قابل تحسین ہوگا، چنانچہ صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ سے اس امر کی شکایت کی کہ بعض وقت برے خطرات دل میں آتے ہیں جن کا بیان ناگوار ہوتا ہے فرمایا کیا تم ان کو برے سمجھتے ہو؟ عرض کیا جی ہاں! فرمایا یہی تو ایمان ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اگر ایمان نہ ہوتا تو اس کو برا کیوں سمجھتا؟ بے ایمان تو برے خطروں کو پرورش کر کے ان سے

کام لیتا ہے۔

غرضکہ نفسِ خطرہ اور وسوسہ برا نہیں اس وقت تک کہ برے وسوسے کو اچھا نہ سمجھے یا اس پر عمل نہ کرے جب وسوسۂ شیطانی دل میں پیدا ہوا اور آدمی یہ خیال کرے کہ اس کا خالق خدائے تعالی ہے اس میں میرے فعل کو کوئی دخل نہیں کیونکہ ہر اختیاری کام میں پہلے اس کا علم اور ارادہ ضرور ہوا کرتا ہے، اور اس خطرے کے وقت نہ اس کا علم اور ادراک تھا نہ اس کی جانب ارادہ مبذول ہوا، جس سے ظاہر ہے کہ ہمارے فعل کو اس میں کوئی دخل نہیں تو یہی خیال باعث تقرب الٰہی ہوگا، کیونکہ جب تک اس خیال میں وہ مصروف ہے خدائے تعالی کا ذکر اور مشاہدۂ صفات الٰہیہ ہے، اور بمصداق حدیث شریف انا جلیس من ذکرنی حق تعالی کے ساتھ اس کو مجالست حاصل ہے، اور بمصداق آیت شریف فاذکرونی اذکرکم وہ اس درجہ پر فائز ہے کہ خدائے تعالی اس کا ذکر فرما رہا ہے، دیکھئے وہ وسوسہ شیطانی کس قدر باعث تقرب الٰہی ہوگیا! مگر یہ بات ہر شخص کو حاصل ہونا مشکل ہے ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے کہ جہاں شیطان نے وسوسہ ڈال کر برے کام کی طرف توجہ دلائی اس کام کی طرف متوجہ ہوگئے اور نفس ناطقہ کو اپنی خواہش پوری کرنے کی فکر ہوگئی اگر کوئی مانع نہ ہو تو اس کو پوری کر بھی لیا مثلاً جس طرح دیوانوں کا حال ہوتا ہے کہ جب ان کے دل میں کسی کو مارنے کا وسوسہ اور خیال آجاتا ہے تو بلا تامل مار بیٹھتے ہیں بخلاف عقلاء کے کہ وہ اس خیال میں غور و تامل کرتے ہیں پھر جس قدر عقل زیادہ ہوگی غور و فکر زیادہ ہوگی اعلی درجے کا عاقل وہ سمجھا جائے گا جو

اس امر پر غور کرے کہ ایسا خیال کیوں پیدا ہوا اور اس کا منشا کیا ہے؟ اور اس کے موافق عمل کیا جائے تو اس سے کس قسم کی خرابیاں پیدا ہوں گی۔

غرضکہ جو عقلاء ہیں وہ سب سے پہلے یہ خیال کرتے ہیں کہ اس خیال کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ جب ان کو ایمانی طریقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے خدائے تعالی کے کوئی اس کا خالق نہیں تو اس کے نتائج پر غور کرتے ہیں کہ آیا وہ فعل جس سے وسوسہ متعلق ہے باعث خوشنودی الٰہی ہے یا باعث غضب؟ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ باعث خوشنودی الٰہی ہے تو فوراً اس وسوسہ کے مطابق کام کر لیتے ہیں اور اس وسوسہ کو اس حدیث شریف کے موافق اچھا سمجھتے ہیں جو تفسیر در منثور میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ یہ دعاء کیا کرتے تھے **اللھم اعمر قلبی من وسواس ذکرک واطرد عنی وسواس الشیطان** یعنی: یا اللہ میرے دل کو تیرے ذکر کے وسواس سے آباد رکھ اور شیطان کے وسواس مجھ سے دور کر، اور اگر یہ معلوم ہو کہ وہ وسوسہ باعث غضب الٰہی ہے تو خشیت اور خشوع ان پر طاری ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ صفت اضلال کا ظہور ہو رہا ہے اور واسطہ اس میں شیطان ہے کیونکہ ہدایت کرنا اور گمراہ کرنا دونوں خدائے تعالی ہی کے کام ہیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ: نہ مجھے ہدایت میں دخل ہے نہ شیطان کو گمراہی میں یعنی دونوں خدا ہی کے کام ہیں چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے **یضل من یشآء ویھدی من یشآء** یعنی جس کو وہ چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے، اور ارشاد ہے **ومن یضلل فلا ھادی لہ** ۔ جب

یہ خیال متمکن ہوتا ہے کہ اب خدائے تعالی گمراہ کرنا چاہتا ہے تو کمال عجز وانکسار سے وہ دعائیں اورعرض ومعروض شروع کرتے ہیں جس کی تعلیم حق تعالی نے دی ہے مثلاً ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب یعنی: اے رب ہمارے دلوں میں کجی نہ ڈال بعداس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت کر کے اسلام کی سیدھی راہ دکھلا دی ہے اس کے سوااور دعائیں جن کی تعلیم دی گئی ہے کمال تضرع وزاری سے کرنے لگتے ہیں جس سے رحمت الٰہی جوش میں آ کراس وسوسہ کو بے اثر کر دیتی ہے،اورشیطان حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہتا ہے کہ کرنا کیا چاہا تھا اور ہوگیا کیا،اوراگر بمقتضائے بشریت گناہ صادر ہوگیا تو ان کوحزن وندامت ہوتی ہے اورتوبہ کرتے ہیں،یعنی خدائے تعالی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ الٰہی گناہ صادر ہوگیا اوراس کی سزا کا مستحق بیشک ہوں مگراپنے فضل سے تو معاف فرمادے تو تیری عام رحمت سے کچھ بعید نہیں تو غفار ہے ستار ہے۔

کنزالعمال میں یہ روایت ہے کہ فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: بندہ گناہ کرتا ہے پھر جب وہ گناہ اسے یاد آجائے اوراس فعل پر غم ہوتو خدائے تعالی اس کے دل کو دیکھتا ہے اس کی حالت غم کو دیکھ کر وہ گناہ معاف فرما دیتا ہے۔

والذین اذافعلوا فاحشۃ اوظلموا انفسھم ذکروا اللہ فاستغفروا لذنوبھم ،ولم یصروا علی مافعلوا وھم نادمون غرضکہ صدق دل سے وہ خدائے تعالی کی بارگاہ میں التجا کر کے گناہ کو معاف کروالیتا ہے اوروہ اس

شخص کے مثل ہو جاتا ہے جس نے گناہ کیا ہی نہیں، جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہے

التائب من الذنب کمن لاذنب له .

توبہ:

ترغیب وترہیب میں بخاریؒ اور مسلمؒ وغیرہ سے منذری نے نقل کیا ہے کہ فرمایا

رسول اللہ ﷺ نے کہ جب کوئی بندہ توبہ کرتا ہے تو خدائے تعالیٰ کو اس مسافر سے بھی

زیادہ خوشی ہوتی ہے جو اپنا کھانا پانی وغیرہ حوائج اونٹ پر رکھ کر جا رہا تھا کسی جنگل میں

اونٹ سے اتر کر سو رہا جب بیدار ہوا تو دیکھا کہ اونٹ غائب ہے اس کی تلاش میں

نکلا اور بہت پریشان ادھر ادھر پھرا مگر کہیں اس کا پتہ نہ پایا جب دھوپ سخت ہوئی اور

بھوک اور پیاس غالب ہوئی اور موت آنکھوں میں پھر گئی تو کہا کہ چلو اسی مقام پر جا کر

مرجائیں جہاں سے اونٹ چلا گیا اور اس مقام میں آکر سو رہا جب آنکھ کھلی تو کیا

دیکھتا ہے کہ اونٹ کھڑا ہے اور توشہ پانی وغیرہ محفوظ ہے یہ دیکھ کر مارے خوشی کے کہنے لگا

یا اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں! کمال خوشی میں یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ کیا کہہ رہا

ہے، اب غور کیجئے کہ اس حالت مایوسی میں کس قدر خوشی ہونی چاہیئے! اس کا صحیح اندازہ

آرام سے گھر میں بیٹھنے والے نہیں کر سکتے، مگر اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ خوشی

کا کوئی درجہ نہ ہوگا، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جب کوئی بندہ توبہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ کو

اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جو شخص مذکور کو ہوئی، یہ شان ارحم الراحمین ہے کہ توبہ کا نفع تو بندہ کو ہو اور ابدالآباد بے انتہا نعمتوں میں خوش رہے اور خوشی خدائے تعالی کو ہو۔

اسی کی تائید اس حدیث شریف سے ہوتی ہے جو کنز العمال میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا **لولم تذنبوا لذھب اللہ بکم ،الخ**! جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: اگر تم گناہ کرتے اور خدائے تعالی سے مغفرت مانگتے اور وہ اس کو بخش دیتا، اس سے مقصود یہ نہیں کہ آدمی گناہ کیا کرے، بلکہ بات یہ ہے کہ صحابہؓ سے جب کبھی گناہ سرزد ہوتا تھا تو مارے خوف کے زندگی ان پر وبال ہوجاتی تھی، اس کی تصدیق ماعز کے واقعہ سے ہوتی ہے جو کتب احادیث میں مذکور ہے کہ ان سے زنا وقوع میں آیا، ساتھ ہی وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے زنا کیا مجھ پر حد جاری فرمایئے! حضرت ﷺ نے بہت کچھ اغماض فرمایا اور ٹالا مگر وہ نہ مانے چنانچہ رجم کا حکم دیا گیا جس سے وہ شہید ہو گئے، جب صحابہؓ کو گناہ سے اس درجہ خوف تھا کہ زندگی ان پر وبال ہوجاتی تھی تو ان کی تسکین کے لئے ارشاد ہوا کہ: اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدائے تعالی ایسی قسم کو پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور توبہ کرتی، مقصود یہ کہ اگر گناہ ہو جائے تو توبہ کر لینا چاہئے اور رحمت خداوندی سے ہرگز مایوس نہ ہونا چاہئے۔

الحاصل حدیث مذکور سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ خدائے تعالی کو یہ امر نہایت مرغوب ہے کہ گناہ گار توبہ کرے اور وہ اس کو بخشدے، چونکہ حق تعالی ارحم الراحمین ہے اور صفت رحمت اس میں بڑھی ہوئی ہے، اور مغفرت رحمت کا ایک شعبہ ہے اس لئے توبہ

کونہایت دوست رکھتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ تا کہ توبہ کے بعد مغفرت فرمادے، اور توبہ بغیر گناہ کے نہیں ہوسکتی تھی اس لئے یہ اہتمام ہوا کہ ایک بھٹکانے و بہکانے والا پیدا کیا گیا چنانچہ حدیث شریف میں ہے جو کنز العمال میں مذکور ہے کہ: اگر خدائے تعالی کو یہ منظور ہوتا کہ کوئی اس کی معصیت نہ کرے تو ابلیس کو نہ پیدا کرتا، اور ارشاد باری تعالی ہے وَلَوْ شَآءَ لَھَدٰاکُمْ اَجْمَعِیْنَ۔

جب توبہ سے خدائے تعالی کو نہایت خوشی ہوتی ہے تو ہر مسلمان کو چاہئے کہ توبہ کرے، کنز العمال میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے لوگو توبہ کرو، خدا کی قسم میں ہر روز سو بار توبہ کیا کرتا ہوں، اس میں شبہ نہیں کہ آنحضرت کو توبہ کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ آپ سے گناہ صادر ہی نہیں ہوا، مگر باوجود اس کے آپ توبہ کرتے تھے اس وجہ سے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین یعنی نیک لوگوں کے حسنات مقربین کے گناہ ہیں کیونکہ مقربین کی شان کے گناہ بھی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ہمیں وہ نصیب ہوجائیں تو ہماری نجات ہوجائے۔

بہرحال آنحضرت ﷺ کا توبہ کرنا ثابت ہے تو اب مشائخین اور پیروں کو کس قدر توبہ کی ضرورت ہوگی! یہاں تو علانیہ وہ گناہ ہیں جس کو ظاہر شریعت نے گناہ قرار دیا ہے یوں تو ہر بندہ کا فرض ہے کہ اپنے خالق کو خوش کرے مگر جن لوگوں کو محبت الٰہی کا دعوی ہے اور زمرۂ اہل اسلام میں اسی خصوصیت سے سربرآوردہ سمجھے جاتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ ان کی تعظیم وتوقیر کرتے ہیں وہ بہ نسبت مریدین کے زیادہ اس امر کے

مستحق ہیں کہ گناہوں سے توبہ کر کے اپنے محبوب کوخوش کریں اگر یہی حضرات ایسے کاموں میں مبتلا ہوں جن کو خدائے تعالی اور نبی کریم ﷺ نے گناہ قرار دیا اور صاف ارشاد ہوا کہ ایسے کام کرنے والوں سے خدائے تعالی ناخوش ہے تو کہئے کہ کس قدر بے موقعہ ہوگا، اور مریدین کو بھی لازم ہے کہ سلوک کی راہ میں آنے سے قبل خدائے تعالی کو خوش کریں، چنانچہ قوت القلوب وغیرہ کتب تصوف میں لکھا ہے کہ پیر کو چاہئے کہ مرید کو سب سے پہلے توبہ کرنے کا حکم دے۔

مگر یہ بات یاد رہے کہ زبان سے ''توبہ توبہ'' یا اتوب الی اللہ کہہ دینا کافی نہیں ، بلکہ بزرگان دین کے نزدیک یہ خود گناہ ہے جیسا کہ قوت القلوب جو حضرات صوفیہ کے نزدیک معتبر کتاب ہے اور بزرگان دین نے اس کے مطالعہ کی تاکید فرمایا کرتے تھے اس میں لکھا ہے کہ بعض بزرگوں کا قول ہے کہ: جب میں استغفر اللہ زبان سے کہتا ہوں اور دل میں ندامت نہیں ہوتی تو اس بات سے استغفار کرتا ہوں اور خدائے تعالی سے مغفرت مانگتا ہوں، اور لکھا ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ: زبان سے استغفار کرنا بغیر اس کے کہ دل میں ندامت ہو جھوٹوں کی توبہ ہے، اور رابعہ بصریہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ہمارا استغفار کرنا خود دوسرے استغفار کا محتاج ہے، اسی طرح توبہ اس کی محتاج ہے کہ اس سے توبہ کی جائے۔

حضرات غوث الثقلین غنیۃ الطالبین میں لکھتے ہیں کہ: توبہ ہر شخص کے لئے فرض عین ہے کوئی بشر اس سے مستغنی نہیں کیونکہ وہ جوارح اور اعضاء کی معصیتوں سے بچ

نہیں سکتا اور اگر اس سے بچ بھی گیا تو دل کے گناہوں کے ارادہ سے بچ نہیں سکتا اور اگر اس سے بھی بچ گیا تو شیطان جو دل پر مختلف خطرے ڈالتا ہے جن کی وجہ سے ذکر الٰہی سے غافل ہو جائے بچ نہیں سکتا اور اگر اس سے بھی بچ جائے تو غفلت اور علم صفات وافعال الٰہی کے حاصل کرنے میں قصور اور کوتاہی کرنے سے بچ نہیں سکتا، یہ تمام مؤمنین کے احوال اور مقامات ہیں جن کے لئے طاعات اور گناہ اور حدود اور شروط مقرر ہیں، حفاظت ان کی طاعت ہے اور ان کا چھوڑ دینا اور ان سے غفلت کرنا گناہ ہے، بہرحال ہر شخص کو ہر حالت میں توبہ کی ضرورت ہے مگر مقامات جدا جدا ہیں عوام کی توبہ گناہوں سے ہوگی اور خواص کی توبہ غفلت سے اور خاص الخاص کی توبہ ماسوی اللہ کی طرف مائل ہونے سے۔

اور فرمایا کہ: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ایماندار اپنے گناہ کو مثل پہاڑ کے سمجھتا ہے جو اس کے سر پر معلق ہو وہ ڈرتا ہے کہ یہ پہاڑ کہیں مجھ پر گر نہ جائے اور منافق گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے مکھی ناک پر بیٹھی اور اس کو اڑا دیا۔

اب غور کیجئے کہ جب حضرت پیر دستگیر گناہوں سے اس قدر خوف دلاتے ہیں اور توبہ کی شدید ضرورت بیان فرماتے ہیں تو ہم مریدوں کو اس کا کس قدر اہتمام کرنا چاہیئے، اس کی وجہ یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا **من لا یستغفر لا یغفر الله له ،ومن لایتوب لایتوب الله علیه** یعنی جو شخص خدا سے مغفرت نہ مانگے خدا اس کو نہیں بخشتا اور جو شخص توبہ نہ کرے خدا اس کی طرف توجہ بہ رحمت نہیں کرتا یہ روایت

کنزالعمال میں ہے۔

بہرحال جتنے بزرگان دین ہیں سب نے اپنے مریدوں کو یہی تعلیم وتلقین ووصیت کی ہے کہ گناہوں سے توبہ کیا کریں، کیوں نہ ہوحق تعالی کاارشاہے فَتُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعاً اَیُّھَا الْمُؤْنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ یعنی اے ایمان والوتم سب کے سب توبہ کرواوراللہ کی طرف رجوع کروتا کہ تم فلاح پاؤ،اورارشاد ہے تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَصُوْحاً عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّئَاتِکُمْ یعنی:اے مسلمانوخالص توبہ کروخدائے تعالی تمہارے گناہوں کوبخش دے گا۔

یہاں یہ امرقابل توجہ ہے کہ اذکارواشغال نوافل میں داخل ہیں اورگناہوں سے توبہ کرنافرض ہے،کیونکہ باربارخدائے تعالی نے اس کاحکم فرمایاہے،اورظاہرہے فرض کوچھوڑکرنوافل کااداءکرنامفیدنہیں ہوسکتا کیونکہ نوافل کوترک کرنے سے مؤاخذہ نہیں،اورفرض کوترک کرنے پرسوال اورمؤاخذہ ہوگا۔

فوائدالفوادکی مجلس ہفتم ماہ رجب ۱۵ے ھ میں لکھاہے کہ حضرت محبوب الٰہی سیدنظام الدین قدس سرہ نے فرمایاکہ توبہ تین قسم پرہے،حال،ماضی،مستقبل،حال یہ ہے کہ جوگناہ کیاہےاس سے نادم اورپشیمان ہو،ماضی وہ ہے کہ مخالفوں کوخوش کرے اگر کسی سے دس درہم غصب کیاہواوراس سے توبہ کرنے کے خیال سے ’’توبہ توبہ‘‘ کہئے تو یہ توبہ نہ ہوگی،توبہ وہ ہے کہ درہم اس کوواپس کرکے اس کوخوش کرےاوراگروہ کسی کو براکہاہواس کی معذرت کرکے اس کوخوش کرےاوراگروہ شخص مرگیاہوتوجتنے باراس کی

برائی بیان کی ہے اس کی تعریف کرے، اور گر شراب سے توبہ کرنا چاہے تو عمدہ شربت اور ٹھنڈا پانی کثرت سے پلائے، مقصود یہ ہے کہ توبہ کے وقت معذرت ہر میصیت کی اسی کے مناسب ہونی چاہئے، توبہ کی تیسری قسم جو مستقبل ہے وہ یہ ہے کہ نیت کرے کہ آئندہ اس قسم کا گناہ نہ کروں گا۔

اس کے بعد فرمایا کہ: میں جب شیخ الاسلام فریدالحق والدین قدس سرہ العزیز کی خدمت میں بیعت کی غرض سے حاضر ہوا تو بار بار فرمایا کہ اپنے خصموں کو راضی کرنا چاہئے! جب اس میں بہت غلو فرمایا تو مجھے یاد آ گیا کہ میرے ذمہ بیس جیتل واجب الاداء ہیں اور ایک شخص سے میں نے کتاب عاریت لی تھی وہ گم ہوگئی میں سمجھ گیا کہ حضرت کشف سے یہ بیان فرما رہے ہیں، میں نے دل میں یہ عہد کرلیا کہ جب دہلی جاؤں گا تو ان کو خوش کروں گا جب اجودھن سے دہلی آیا اس وقت میری معیشت بہت کم تھی، کبھی پانچ جیتل میرے پاس جمع ہوئے اور کبھی زیادہ، ایک بار دس جیتل میرے ذمہ تھی اور اس سے کہا کہ بیس جیتل تمہارے میرے ذمہ ہیں مجھے ایک ہی دفعہ میں میسر نہ آئے یہ دس جیتل جو لایا ہوں ان کو لے لو اور باقی بھی انشاءاللہ دے دوں گا، جب اس نے یہ بات سنی تو کہا کہ: ہاں تم مسلمان کے پاس سے آتے ہو اور وہ لے لیا اور کہا کہ باقی دس جیتل تمہیں معاف کردیا، اس کے بعد میں اس شخص کے پاس میں گیا جس سے کتاب لی تھی اس سے کہا کہ جو کتاب آپ سے میں نے لی تھی وہ گم ہوگئی اب کہیں سے اس کی نقل لے کر آپ کو پہونچادوں گا! اس نے یہ سن کر کہا کہ ہاں جہاں سے تم آئے ہو

اس کا ثمرہ یہی ہونا چاہئے! اس کے بعد کہا کہ میں نے وہ کتاب آپ کو بخش دی۔

توبہ اور بیعت:

اور فوائد الفواد کی مجلس ۲۱/ذیقعدہ ۱۸اے میں مذکور ہے کہ جو شخص شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے اور بیعت کرتا ہے تو وہ خدائے تعالی کے ساتھ عہد و پیمان ہے، چاہئے کہ اس پر ثابت رہے اور اگر اس سے پریشانی ہوتی ہے تو اپنی حالت پر ہی رہے شیخ کا ہاتھ پکڑنے کی کیا ضرورت، اس کے بعد فرمایا کہ: میں جب شیخ الاسلام فرید الحق والدین قدس سرہ العزیز کی خدمت میں پہونچا اور بیعت سے مشرف ہوا تو واپسی کے وقت راستہ میں مجھے شدت سے پیاس لگی، ہوا نہایت گرم تھی اور پانی دور تھا، اسی حالت میں چلا جا رہا تھا کہ ایک شخص نظر آیا جس کو میں پہچانتا تھا اس کے پاس جا کر کہا اس برتن کو لیجئے اور پانی پی لیجئے! میں نے دیکھا کہ اس میں شراب یا بھنگ ہے میں نے اس کے پینے سے انکار کیا، اس نے کہا کہ اس مقام میں دور دور تک کہیں پانی نہیں ہے اور آگے بھی پانی نہیں اگر یہ تم نہ پیوگے تو ہلاک ہو جاؤ گے! میں نے کہا خیر یہی ہوگا کہ میں مرجاؤں گا جو کچھ ہونا ہے ہو رہے گا مگر میں یہ نہیں پی سکتا اس لئے کہ میں نے شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے اور اقرار کیا ہے کہ یہ ہرگز نہ ہوگا! یہ کہہ کر وہاں سے چلا اور تھوڑی دور پر مجھے پانی مل گیا۔

اس کے بعد فرمایا کہ: خواجہ حمید سوالی جب خواجہ معین الحق والدین چشتی قدس سرہ العزیز سے بیعت کر کے اپنے گھر آئے تو قدیم دوست آشنا جمع ہوئے اور کہا کہ چلیئے ذوق حاصل کریں! خواجہ حمید نے کہا کہ میں نے اپنا ازار بند ایسا مضبوط باندھا ہے کہ قیامت میں بھی حوران بہشت پر نہ کھولوں گا۔

اور اسی کی مجلس ۲۰؍ جمادی الاولی میں لکھا ہے کہ: حضرت محبوبِ الٰہی نے فرمایا کہ: ایک مطربہ ''قمر'' نام نہایت حسن و جمال میں شہرۂ آفاق تھی، آخر عمر میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے ہاتھ پر بیعت کر کے زیارت کعبہ کے لئے گئی، جب واپسی میں ہمدان کو پہنچی تو والی ہمدان نے اسکی خبر سن کر اس کو بلوایا اس نے کہا کہ میں اس کام سے توبہ کر چکی ہوں! والی نے اس کا عذر قبول نہ کیا آخر وہ عورت عاجز ہوکر شیخ یوسف ہمدانی کی خدمت میں گئی اور واقعہ بیان کیا شیخ نے فرمایا آج رات کو میں تمہارے معاملہ میں مشغول ہوں گا اور کل جواب دوں گا! صبح ہی وہ عورت شیخ کی خدمت میں پھر حاضر ہوئی شیخ نے فرمایا کہ: ابھی تمہارے خانۂ تقدیر میں ایک معصیت باقی ہے! عورت عاجز ہوگئی اور ملازمین اسے بادشاہ کے پاس لے گئے اور ایک چنگ لاکر اسکو دیا، اس نے چنگ کو درست کر کے گانا بجانا شروع کیا چند اشعار پڑھے تھے کہ سب پر حالت طاری ہوئی اور بادشاہ ہمدان نے سب سے پہلے توبہ کی، اب غور کیجئے کہ بیعت کا کس قدر اثر ہوتا تھا کہ مرجانا قبول مگر خلاف شرع بھنگ وغیرہ پینا ناگوار، اسی وجہ سے ان حضرات کی بیعت پر ثمرات مرتب ہوا کرتے تھے حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ تو مقام محبوبیت پر فائز

ہونے والے تھے بلکہ ازلی محبوب تھے ہی ان کی ہمت اگر بلند تھی تو چنداں تعجب کی بات نہیں، اس کسی کا حال آپ نے دیکھ لیا کہ بیعت کے بعد پھر گناہ کا کبھی ارادہ نہ کیا، اس علوے ہمت اور بیعت پر قائم رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر گناہ کیا بھی تو اس گناہ کے طفیل میں بادشاہ اور اس کے مصاحبین کو توبہ کرا کے چھوڑا۔

نفحات الانس میں مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ نے حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ کے حال میں لکھا ہے کہ آپ نے مریدین کو فرمایا کہ: اپنے نفس کو متہم بنا رکھو، جو شخص بعنایت الٰہی اپنے نفس کی بدی کو پہچانے اور اس کے مکر و کید کو جانے اس پر یہ کام یعنی نفس کو متہم سمجھنا آسان ہے! سالکان طریقت ایسے بہت گزرے ہیں کہ دوسرے کے گناہ کو اپنے ذمہ لے کر اس کا بار اٹھایا کرتے تھے اور فرمایا کہ ہمارا طریقہ متابعت رسول اللہ ﷺ کو مضبوط پکڑنا اور صحابہ کے آثار کا اقتداء کرنا ہے اسی طریقے میں تھوڑے عمل سے زیادہ فتوح ہوئی ہیں۔

ہمارے زمانے کے بعض حضرات صاف کہتے ہیں کہ ہمیں نماز روزہ وغیرہ عبادات کی ضرورت نہیں ہم نے ترک وجود کر دیا ہے، اور اس پر اس شعر سے استدلال کرتے ہیں:

نماز عاشقاں ترکِ وجود است

نماز زاہداں سجدہ سجود است

اور مریدین بھی اپنے پیر کے مسلک پر مرفوع القلم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں!! اگر فی

الحقیقت مرفوع القلم ہیں یعنی عقل وادراک جاتا رہا ہے اور اچھے برے میں تمیز باقی نہیں رہی جس طرح کہ مجذوبوں کا حال ہوتا ہے تو ان کا مرفوع القلم ہونا درست ہے، اور اگر یہ حالت نہیں ہے بلکہ وہ اپنے دعوے پر دلائل وغیرہ قائم کرتے ہیں تو وہ عنداللہ مرفوع القلم نہیں ہوسکتے، دیکھئے حضرت حسین بن منصور حلاج باوجودیکہ ''انا الحق'' کہتے تھے اور ان کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں چنانچہ آخرکار بفتوائے جنید بغدادیؒ وغیرہ اکابر صوفیہ وعلماء اسی قول کی وجہ سے وہ دار پر چڑھائے گئے مگر عبادت کو انہوں نے کبھی ترک نہ کیا، نفحات الانس میں لکھا ہے کہ: باوجود دعوائے ''انا الحق'' کے ہر شبانہ روز وہ ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے، چنانچہ جس صبح وہ قتل ہوئے اس رات میں پانچ سو رکعت نماز انہوں نے پڑھی تھی۔

تنبیہ المغترین میں امام شعرانیؒ نے لکھا ہے کہ: صوفیہ کے اخلاق میں سے کثرت توبہ واستغفار بھی ہے کیونکہ وہ اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اپنے افعال گناہ سے سالم نہیں رہ سکتے کم سے کم خشوع اور مراقبہ میں نقص ہو ہی جاتا ہے، سلف صالح اسی طریقہ پر تھے ہمارے زمانے میں بعض صوفیہ اس کے خلاف میں ہیں یہاں تک کہ بعض صوفیہ سے یہ کہتے سنا ہے کہ: ہم وہ قوم ہیں کہ بحمداللہ ہم پر کوئی گناہ نہیں ہوتا میں نے کہا: کیونکر؟ کہا اس وجہ سے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالی ہی فاعل ہے نہ کہ ہم، میں نے کہا جب تو تم پر توبہ اور استغفار واجب ہے کیونکہ تم نے جمیع ارکان شریعت کو منہدم اور حدود

شرعیہ کو باطل کردیا، قسم ہے اللہ کی اگر مجھے حکومت حاصل ہوتی تو تم جیسے لوگوں کی گردنیں مارتا کیونکہ کل انبیاء اور جمیع اکابر دین جانتے تھے کہ اللہ ہی خالق افعال ہے اور باوجود اس کے کوتاہیوں پر اتنا روتے تھے کہ ان کے آنسوؤں سے گھانس اگتی تھی، اور آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ کیا تمہاری بیماری اور دوا کی خبر نہ دوں؟ تمہاری بیماری گناہ ہیں اور دوا استغفار انتہی ملخصاً، دیکھئے امام شعرانیؒ اولیاء اللہ میں سے ہیں اور تمام صوفیہ سلف کے حال کی خبر دے رہے ہیں کہ سب کثرت سے استغفار اور توبہ کیا کرتے تھے! تو ہم لوگوں کو گناہ سے احتراز کرنے اور اس سے توبہ واستغفار کرنے کی کس قدر ضرورت ہے۔

جامیؒ نے نفحات الانس میں شیخ ابوالحسن شاذلیؒ کے حال میں لکھا ہے ان کا بیان ہے کہ: میں نے غار میں قیام کیا اور وصول الی اللہ طلب کرکے دل میں کہتا تھا کہ کل فتح ہوجائے گی! یکا یک ایک شخص آیا میں نے پوچھا تم کون ہو؟ کہا عبدالملک! میں سمجھ گیا کہ وہ اولیاء اللہ سے ہیں، میں نے کہا آپ کا کیا حال ہے؟ کہا: آپ کا کیا حال؟ آپ کا کیا حال؟ آپ کا کیا حال؟ اس شخص کا کیا حال ہوگا جو کہتا ہے کہ کل فتح ہوجائے اور پرسوں فتح ہوجائے نہ ولایت ہے نہ فلاح، اے شخص خدائے تعالی کی عبادت خاص خدائے تعالی کے لئے کیوں نہیں کرتا؟ میں اس وقت سمجھ گیا کہ یہ بزرگ خاص تعلیم کے لئے بھیجے گئے ہیں میں نے اسی وقت توبہ کی اور استغفار کیا اس کے بعد فتح یاب بھی ہوگیا ، دیکھئے ان حضرات کو دلی خطرات اور خیالات پر توبہ کرنے کی ضرورت ہوتی

ہے، برخلاف اس کے کھلے کھلے گناہ جن کے خلاف مرضی الٰہی ہونے میں ذرا بھی شک نہیں ہوسکتا ان گناہوں سے توبہ نہ کی جائے تو کہئے کہ فتح یابی جو پیری مریدی سے مقصود ہے کیونکر ہوسکے۔

اخبار الاخیار میں شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے حضرت خواجہ بزرگ معین الدین چشتی قدس سرہ العزیز کے حال میں آپ کا ارشاد نقل کیا ہے ''شقاوت کی علامت یہ ہے کہ آدمی معصیت کرے اور امید رکھے کہ میں مقبول ہوں گا''۔ یہ ارشاد خاص اہل طریقت سے متعلق معلوم ہوتا ہے کیونکہ مقبولیت کی گفتگو اسی طبقہ میں ہوتی ہے اور ہونا بھی چاہیئے، اس لئے کہ یہ حضرات دنیا کے کام دھندے چھوڑ کر خدائے تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یعنی ذکر و شغل وغیرہ میں اکثر اوقات مشغول رہتے ہیں اس کے بعد ضرور یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ اپنی محنت وجاں فشانی رائگاں نہ جائے گی اور ہم مقبول بارگاہ کبریائی ہوں گے، ان حضرات کو حضرت خواجہ بزرگ فرماتے ہیں کہ: یہ علامت شقاوت ہے مقبول تو وہی لوگ ہوتے ہیں جو کوئی کام خلاف مرضی الٰہی نہیں کرتے اور اگر بمقتضائے بشریت کرلیا تو اس کی معذرت اور توبہ کرتے ہیں بخلاف اس کے کہ مرضی الٰہی کا بھی کریں اور امید رکھیں کہ ہم مقبول الٰہی ہیں، اس قسم کا خیال پیدا ہونا ضرور شقاوت کی علامت ہے اور یہ بھی ارشاد حضرت کا نقل کیا ہے کہ: از منزل گاہ قرب نزدیک نشو مگر بفرماں برداری در نماز، زیرا کہ معراجِ مومن ہمیں نماز است۔

دیکھئے قرآن شریف میں اقیموا الصلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرو کتنی جگہ وارد

ہے؟ اور احادیث میں کس قدر اس کا اہتمام ہے یہاں تک کہ نماز کو قصداً ترک کرنے والے کو آنحضرت ﷺ نے کافر تک فرمادیا۔

غرضکہ فرمانبرداری نماز ضروریات دین سے ہے، اسی وجہ سے خواجہ بزرگ قدس سرہ نے صاف فرمایا کہ بغیر نماز کے تقرب الٰہی حاصل نہیں ہوسکتا، اب اگر تاویل کر کے کوئی نماز ہی دوسری قرار دی جائے تو فرقۂ باطنیہ اور صوفیہ میں فرق ہی کیا ہوا؟ انہوں نے بھی ایسے ہی تاویلیں کر کے تمام عبادات کو ساقط اور زنا وغیرہ کو مباح کر دیا تھا

۔

اخبار الاخیار میں شیخ نصیر الدین محمودؒ خلیفہ محبوب الٰہی قدس سرہ کے حال میں لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا: من چہ لائقم کہ شیخی کنم امروز خود ایں کار بازی بچگاں شد بعد ازاں بیت ثنائی خواند:

مسلماناں مسلماناں مسلمانی مسلمانی ازیں آئین بے دیناں پشیمانی پشیمانی

دیکھئے اس زمانہ کی مشائخی کو آپ نے بچوں کا کھیل قرار دیا وہ اسی قسم کی مشائخی ہوگی کہ ضروریات دین سے جس کو کوئی تعلق نہ ہو۔

اور آپؒ کا قول اس میں نقل کیا ہے کہ: بیعت کے وقت جو سر کے بال تراشے جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی نے طریقت میں قدم رکھا تو گویا اس نے اس راہ میں اپنا سر کٹا دیا اور سر بریدہ سے کوئی کام وجود میں نہیں آسکتا تو چاہئے کہ موئے سر تراشیدہ سے بھی کوئی نامشروع کام وجود میں نہ آئے، دیکھئے طریقت میں اس امر کی

کس قدر ضرورت ہے کہ خلاف شرع کام ترک کرنے کے لئے بیعت سے پہلے گویا ایسا اقرار لیا جاتا تھا۔

اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ

الـــذی موصول اور اس کے بعد کا جملہ صلہ ہے، موصول اور صلہ میں ربط تام ہوتا ہے، اسی وجہ سے موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مفرد ہوتا ہے کیونکہ صلہ میں موصول کا حال ہوتا ہے، موصول ہر چند ذات معین پر دلالت نہیں کرتا مگر صلہ کے ساتھ مل کر معرفہ ہوجاتا ہے، اس لئے کہ جو حالت اس کی صلہ میں بیان کی جاتی ہے اس کو مخاطب جانتا ہے جس سے اس کی تعیین ہوجاتی ہے، مثلاً الـذی ضـربک فی الدار یعنی جس نے تجھے مارا ہے وہ گھر میں ہے، چونکہ مارنے والا مخاطب کو معلوم ہے اس لئے اس کی تعیین ذہن مخاطب میں ہوگئی اس کی مثال ایسی ہے جیسے حق تعالیٰ کی ذات کہ کوئی اس کو پہچان نہیں سکتا کیونکہ وہاں تک نہ عقل کی رسائی ممکن ہے نہ فہم وخیال کی، اس وجہ سے کہ عقل ان ہی چیزوں کا ادراک کرسکتی ہے جو از قسم محسوسات ہوں جیسا کہ ہم نے ''کتاب العقل'' میں اس سے متعلق مبسوط بحث کی ہے اور خدائے تعالیٰ کی ذات ایسی نہیں کہ اس کا ادراک حواس سے ہوسکے یا عقل ووہم سے غرضکہ ذات الٰہی کی معرفت محال ہے ممکن نہیں کہ سوائے خدائے تعالیٰ کے کسی کو اس ادراک ہوسکے البتہ اس قدر ادراک ہوسکتا ہے بلکہ ضروری ہے کہ:

خدائے تعالی موجود ہے اور خالق عالم ہے اور سنتا ہے دیکھتا ہے اور جتنے صفات کمالیہ ہیں سب کے ساتھ متصف ہے، مقصود یہ کہ ذات کے ساتھ صفات کا لحاظ ہونے سے اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے جیسے موصول کے ساتھ صلہ ملنے سے، اسی وجہ سے **ماعرفناک حق معرفتک** وارد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ الٰہی ہم نے تجھ کو پہچانا مگر جس طرح پہچاننے کا حق ہے وہ معرفت حاصل نہیں، موصول کی معرفت صلہ کے ملنے سے جو حاصل ہوتی ہے اور موصول میں جو وحدت آجاتی ہے وہی بات یہاں بھی ہے۔

مراقبہ:

پھر معرفت کے مدارج مختلف ہوتے ہیں جس قدر توجہ اور صفائیِ ذہن زیادہ ہو معرفت زیادہ ہوگی اس زیادتیِ معرفت کے واسطے اولیاء اللہ اور مرشدینِ کامل مراقبہ کی تعلیم کیا کرتے ہیں جس کے معنی نگہبانی کرنے کے ہیں، ذات کے ساتھ ایک ایک صفت کا مدتوں مراقبہ کراتے ہیں تا کہ اس صفت سے متعلق لوازم و آثار پورے طور پر ذہن میں راسخ اور متمکن ہو جائیں جس قدر مدت میں مراقبہ ہو اس میں مشاہدہ ضرور ہوگا کیونکہ مشاہدہ کے معنی حضور کے ہیں یہ مشاہدہ گو ذات حق کا ہوگا مگر کسی صفتِ خاصہ کے ساتھ، کیونکہ ذات بحث کا مشاہدہ مطلقاً غیر متصور ہے، اس لئے کہ ذات کا جب ادراک ہی نہیں تو مشہود کیونکر ہو سکے!! اسی وجہ سے حدیث شریف میں وارد ہے کہ **لا تتفکرو**

ا فی ذات اللہ .

یہ امر پوشیدہ نہیں کہ جب آدمی مدتوں کسی ایک چیز کا مراقبہ کرے یعنی ہمہ تن اس کی طرف مشغول ہو اور کسی دوسری چیز کا خیال تک نہ آنے دے تو اس سے متعلق کیسی کیسی نزاکتوں اور دقائق کا وجود اس کو حاصل ہوگا، دیکھئے حکماء و فلاسفہ مسائلِ حکمیہ میں جو موشگافیاں کیا کرتے تھے اس کا منشا یہی مراقبہ ہوا کرتا تھا وہ پہلے خلوت اختیار کرتے تھے، چنانچہ افلاطون کا حال مشہور ہے کہ کہیں سے ایک شکستہ خم اس کو مل گیا تھا اسی میں وہ رات بسر کرتا اور دن کو تنہائی میں غرضکہ دن رات مسائلِ حکمیہ کے مراقبہ میں مشغول رہتا جس کی وجہ سے اس کی ایک غیر معمولی حالت ہوگئی تھی، چنانچہ تفسیر نیشاپوری میں اس کے متعلق جالینوس کا قول نقل کیا ہے کہ هو انسان تاله او اله تانس یہ حال تقریباً کل حکماء کا تھا کہ تنہائی میں ایک ایک مسئلہ میں مدتوں غور و فکر کرتے یہاں تک کہ اس کے مالہ اور ماعلیہ کا علم بقدرِ طاقتِ بشری حاصل کر لیا کرتے تھے۔

اب غور کیجئے کہ جو لوگ دنیا کو چھوڑ کر ہمیشہ مراقبہ اور مشاہدۂ الٰہی میں رہتے ہیں ان پر ذات وصفات الٰہیہ سے متعلق کیسے کیسے مسائل غامضہ منکشف ہوتے ہوں گے! اور ان کا یہ مجاہدہ کس درجہ بارآور ہوتا ہوگا! حق تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی ہماری راہ میں مجاہدہ کریں تو ضرور ہم ان کو اپنے راستے بتادیں گے، جب خدائے تعالیٰ ان کو اپنے تک وصول وتقرب کی راہیں بتانے کا ذمہ دار ہو تو ممکن نہیں کہ وہ گمراہ ہوسکیں۔

مگر یاد رہے کہ ہر مجاہدہ باعث تقرب نہیں ہوسکتا اس میں بڑی شرط یہ ہے کہ خاص خدائے تعالی کی خوشنودی اور فرمانبرداری پیش نظر ہو، اگر مجاہدہ اور ذکر و شغل میں کوئی دوسرا امر پیش نظر ہو مثلاً کشف یا کرامات یا یہ امر کہ ہم مقتدیٰ کہلائیں اور لوگ ہماری قدر و تعظیم و توقیر کریں یا دست غیب حاصل ہو یا اور کوئی ایسی چیزیں جن کی خواہش نفس کو ہوتی ہے مجاہدہ میں ملحوظ ہوں تو سمجھ لینا چاہئے کہ شیطان کو موقع مل گیا، اسی وجہ سے پہلے وہ ذہن نشین کر دیتا ہے کہ شریعت عام لوگوں کے واسطے ہے اور خاص لوگوں کا درجہ بہت بلند ہے ان کو شریعت پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں!! پہلے ہی قدر میں صوفی صاحب کو خاص لوگوں میں شریک کر کے مرفوع القلم بنا دیتا ہے اب انکو کون روکے؟ نہ خدا کے روکے رکیں نہ رسول کے، کیونکہ قرآن وحدیث سے تو تعلق رہا ہی نہیں، اب وہی حالت پیدا ہوگئی جو ایمان لانے سے پہلے تھی، اس لئے جس طرح ایمان لانے والے کو ایمان سے پہلے بے قیدی تھی اس قسم کے مرفوع القلم ہونے سے بھی وہی بے قیدی ہوجائے گی، غرضکہ دونوں حالتوں میں عقلاً کوئی فرق نہیں، اس صورت میں شیطان جس طرح چاہے گا کام کروا کے چھوڑے گا اسی وجہ سے اکابر اولیاء اللہ نے شریعت کی پابندی کو ضروری لکھا ہے چنانچہ اکابرِ طُرق کے اقوال اس باب میں جو مروی ہیں اوپر لکھے جا چکے ہیں۔

موصول وصلہ میں ایک بات یہ بھی ہوتی ہے کہ صلہ کا اثر موصول پر پڑتا ہے دیکھئے کہ جب الذی کہا جائے تو اس سے متعلق نہ عداوت ہوتی ہے نہ محبت وغیرہ بلکہ اس

کا مفہوم صرف ایک چیز ہوتی ہے جس سے نہ عداوت متعلق ہے نہ محبت، پھر جب اس کے صلہ میں ضــربک یا اس کے مثل کوئی افعال ذکر کئے جائیں تو مفہوم موصول سے عداوت دل میں پیدا ہوگی، اور اگر مثل اعطاک کوئی صلہ ذکر کیا جائے تو اس سے محبت پیدا ہوگی، اس سے ظاہر ہے کہ صلہ کا اثر موصول پر پڑتا ہے۔

نفس ناطقہ یا روح انسانی کی حالت بمنزلۂ موصول کے ہے کہ اس کے ساتھ افعال کا اتصال لازمی ہے، جس طرح صلہ کا اتصال موصول کے ساتھ لازمی ہے، کیونکہ جو صفات نفس ناطقہ میں رکھی گئی ہیں جیسے سخاوت، بخل، شجاعت وغیرہ ان سے متعلق افعال کا ظہور ضروری ہے ورنہ ان صفات کا وجود بیکار ہوگا، اور افعال کے صدور کے وقت نفس کو ان افعال کا ادراک ضرور ہوتا ہے اور ہر فعل کے موجود کرنے کا ارادہ کر کے اپنی قوت کو صرف کرتا ہے، اور جن جن اعضاء سے وہ کام متعلق ہوتا ہے ان کو حرکت دیتا ہے، اس کے بعد لذت کا احساس بھی اسی کو ہوتا ہے جو وجود فعل سے متعلق ہے، خواہ وہ لذت جسمانی ہو یا نہ ہو۔

افعال کا نفس پر اثر:

غرضکہ ابتدائے حدوثِ خطرۂ فعل سے لیکر وقوعِ فعل تک نفس کے ساتھ فعل متعلق رہتا ہے اس کے بعد جب خیال آتا ہے نفس کو اس کے ساتھ تعلق رہتا ہے اسی وجہ

سے نفس میں اس کا اثر ہوتا ہے اور وہ اثر باقی رہ جاتا ہے اگر وہ اچھا کام موافق مرضی الٰہی ہے تو نفس میں اچھا اثر ہوتا ہے اور برا کام ہو تو برا اثر، ان ہی آثار سے اچھے اور برے نفوس باہم ممتاز ہوتے ہیں جن لوگوں کو کشف ہوتا ہے ان کی نظر نفوس کے حسن وقبح پر پڑتی ہے اسی وجہ سے اچھے لوگوں کی وہ تعظیم وتوقیر کرتے ہیں اور معمولی لوگوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

نفس ناطقہ میں افعال کے اثر کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے عفونت وغیرہ ہوا میں اثر کرتی ہے اور ہوا کو جو انسان کی روح کو تازگی اور فرحت بخشتی ہے ان اشیائے خارجیہ کی وجہ سے جانگزا اور مہلک بنادیتی ہے جس کا حال کتب طبیہ میں مصرح ہے، اسی طرح برے افعال روح میں اثر کرکے اس کو گندہ اور مہلک بنادیتے ہیں جس کی صحبت میں جو شخص جائے وہ ہلاک ہو جائے، جب روح گناہوں کی اثر سے زنگ آلودہ ہو جاتی ہے تو خدائے تعالیٰ نے اس کی صیقل توبہ مقرر فرمائی ہے جس سے گناہ بالکل نیست ونابود ہو جاتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے التائب من الذنب کمن لاذنب له۔

گناہ میں دو جہتیں ہیں:

یہاں یہ بات بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ گناہ میں دو جہتیں ہوتی ہیں

،ایک ''معصیت''یعنی نافرمانی کہ خدائے تعالی نے کسی کام کے کرنے کا حکم فرمایا ہومثلاً نماز،روزہ،حج،زکاۃ،صبر،شکر وغیرہ اور وہ نہ کریں یا کسی کام سے منع فرمایا ہے جیسے شراب پینے،حرام کھانے اور زناوظلم وغیرہ کرنے سے!ایسے کام کریں،یہ دونوں صورتیں یعنی ماموکام کا نہ کرنااورممنوع کا کرنا معصیت ہیں۔

اور دوسری جہت ''حق'' کی ہے،مثلاً عبادت حق اللہ ہےاور زکاۃ میں مال سے حق الہی متعلق ہوجاتا ہے،اور کسی کا مال ناجائز طریقہ سے لینے میں معصیت یہ ہے کہ حق تعالی نے اس سے منع فرمایا،اور چونکہ وہ مال کسی شخص کا ہے بندہ کا حق اس سے متعلق ہے،علی ہذا القیاس ''حق اللہ''یا''حق الناس'' گناہوں کے کرنے میں ضرور متأثر ہوتا ہے۔

توبہ سے''حق العباد'' معاف نہیں ہوتا:

توبہ کرنے سے جو چیز معاف ہوتی ہے وہ معصیت ہے کیونکہ نافرمانی کے بعد جب آدمی معذرت کرکے فرماں برداری کرنے کا اقرار کرتا ہے تو سابقہ نافرمانی قابل معافی سمجھی جاتی ہے مگر جو حق ذمہ پر ثابت ہوگیا وہ معاف نہیں ہوتا اگر کسی شخص نے نمازیں قضاء کی ہوں اس کے بعد توبہ کرکے نماز پڑھنا شروع کرے تو جن ایام کی نمازیں نہیں پڑھیں ان کی قضاء کرنا ضروری ہے،اسی وجہ سے اگر نمازیں یا روزے

وغیرہ کسی کے ذمہ باقی رہ گئے ہوں اوران کی اس نے قضاء نہیں کی تو بعد وصیت اس کے بدلہ میں مال دینے کی ضرورت ہوتی ہے ،اور مثلاً اگر کسی نے رشوت سے توبہ کی تو معصیت معاف ہوجائے گی مگر جو مال لیا تھا وہ واپس کرنے کی ضرورت ہے ورنہ قیامت میں اس کا معاوضہ دلایا جائے گا ،غرضکہ توبہ سے صرف معصیت کی معافی ہوسکتی ہے حقوق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ،اس میں شک نہیں کہ حق تعالی اگر چاہے تو اپنے حقوق معاف کردے اور قادر ہے کہ دوسروں کے حقوق کو بھی معاف کروادے،مگر یہ قاعدہ نہیں ہوسکتا اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ جس پر جو کچھ حقوق ہیں عموماً سب کو حق تعالی معاف کردے گا اور کروادے گا ،اگر ایسا ہو تو تمام مصالحِ تمدن درہم وبرہم ہوجائیں گے،عقل ہرگز جائز نہیں رکھتی کہ ظالم اور مظلوم دونوں حق تعالی کے نزدیک برابر اور قابل ترحم ہوں !!رہا یہ کہ قرآن شریف میں ہے **قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسهم لاتقنطوا من رحمة الله ان الله یغفر الذنوب جمیعاً انه هو الغفور الرحیم** یعنی اے محمدؐ! کہہ دو کہ اے گناہ گارو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اللہ سب گناہوں کو بخشتا ہے وہ غفور رحیم ہے،سو یہ ارشاد اس وقت ہوا تھا کہ بعض لوگوں نے اسلام لانے میں عذر کیا تھا کہ ہم نے بڑے بڑے گناہ کئے اب اسلام لانے سے کیا فائدہ؟ان کو جواب دیا گیا کہ خدائے تعالی سب گناہوں کو بخش سکتا ہے، چنانچہ اس آیت کے بعد ہی یہ آیت ہے **وانیبوا الی ربکم واسلموا له** جس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے تعالی کی طرف متوجہ ہوجاؤ اور اسلام لاؤ قبل اس کے کہ تم پر عذاب نازل ہو۔

غرضکہ قرآن وحدیث سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا بالکل مؤاخذہ نہ ہوگا، بلکہ ہزار ہا آیات واحادیث وآثار سے مؤاخذہ ثابت ہے ،اس لئے مقتضائے عقل یہی ہے کہ آدمی اسی عالم میں مؤاخذوں سے حتی الامکان براء ت حاصل کرلے۔

فی صدور الناس

''صدر'' سینہ کو کہتے ہیں سینہ وہ مقام ہے جس میں دل رکھا گیا ہے گویا سینہ دل کا مکان ہے شیطان وسوسہ انداز بھی اسی گھر میں رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً برے مشورہ دیتا جاتا ہے یہی وساوس شیطانی ہیں۔

ہر چیز کی اصل اور حقیقت:

سینہ کی حقیقت جو ظاہراً معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ چند ہڈیوں اور گوشت وغیرہ سے مرکب ہے مگر دراصل اس کی حقیقت کچھ اور ہی ہے جس طرح انسان کا حال کہ دیکھنے کو وہ ہڈیوں اور گوشت پوست سے مرکب ہے اور اس میں اور بندر وغیرہ میں کوئی فرق نہیں مگر حقیقتِ انسان کو دیکھا جائے تو وہ کچھ اور ہی چیز ہے جس کا ادراک ممکن نہیں کیونکہ وہ ایسی لطیف چیز ہے جس سے حواس بالکل بے خبر ہیں۔

جسم انسانی انسان کا غلاف ہے:

یہ جسم جس کو دیکھنے والے انسان کہتے ہیں وہ انسان کا قدرتی غلاف یا لباس ہے، جس کے ٹوٹنے پھوٹنے سڑنے گلنے سے انسان پر کوئی اثر نہیں ہوتا، بلکہ اپنی حالت پر محفوظ رہتا ہے مقاصد الاسلام کے حصہ دوم میں ہم نے یہ امر بدلائل ثابت کیا ہے کہ مسمریزم والے اس امر کا مشاہدہ کرادیتے ہیں کہ جسم انسانی اپنے مقام پر پڑا رہتا ہے اور انسان ہزار ہا کوس جا کر وہاں کی خبریں چند دقیقوں میں لاتا ہے۔

سماعِ موتٰی:

حکمتِ جدیدہ تصدیق اسی امر کی کر رہی ہے جس کی خبر آنحضرت ﷺ نے تیرہ سو (۱۳۰۰) سال پیشتر دی تھی، دیکھئے تمام کتب احادیث وسیر سے ثابت ہے کہ غزوۂ بدر میں جب کفار کو ہزیمت ہوئی اور ان کے مقتولوں کی لاشیں پھول سڑ گئیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان لاشوں کو کنویں میں ڈال دو! چنانچہ سب ڈال دی گئیں، اس رات آنحضرت ﷺ نے ان مقتولوں کو پکار کر فرمایا: اے کنویں والو! اے عتبہ، اے شیبہ، اے امیہ، اے ابوجہل! کیا تمہارے رب نے جو وعدہ فرمایا تھا اس کو تم نے حق پایا؟ میں نے تو وہ وعدہ حق تعالی نے جو مجھ سے کیا تھا حق پایا؟ صحابہؓ نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ کیا آپ ایسی قوم کو پکارتے ہیں جس کی لاشیں سڑ گئیں؟ آپ نے فرمایا: میں ان سے کہہ رہا ہوں اس کو وہ لوگ ایسا سن رہے ہیں کہ تم ان سے زیادہ نہیں سن سکتے

لیکن وہ میرا جواب نہیں دے سکتے چنانچہ حسان بن ثابت نے اس موقع پر ایک قصیدہ لکھا جس کے دو شعر یہ ہیں:

ینا دیھم رسو ل اللہ لما قذفنا ھم کباکب فی القلیب

الم تجدوا کلامی کان حقاً وامر اللہ یا خذ بالقلوب

دیکھئے صحابہ نے یہی خیال کیا تھا کہ سڑی ہوئی لاشوں کو پکار کر ان سے باتیں کرنی بالکل خلاف عقل ہے! مگر آنحضرت ﷺ نے یہ بات اشارۃً بیان فرمادی کہ آدمی جسم کا نام نہیں جسم بمنزلہ غلاف ہے، اصل آدمی جو سننے والا ہے اس میں کوئی تغیر نہیں جیسے وہ زندگی میں سنتے تھے اب بھی سنتے ہیں، صحابہ اور قوی الایمان تو مان گئے مگر خلاف عقل ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے اس میں تاویلیں کیں۔

قبر میں مردہ کو اٹھا کر اس سے سوال:

چنانچہ ''سماع موتی'' کا مسئلہ اب تک معرکہ آرا بنا ہوا ہے سائنس نے آکر اس کا تصفیہ کردیا اب اس میں کسی کو چون چرا کی گنجائش نہ رہی اس سے اس مسئلہ کا بھی تصفیہ ہوگیا جو احادیث میں وارد ہے کہ دفن کے بعد فرشتے مردے سے سوال کرتے ہیں کہ: تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے اور انکو یعنی محمد ﷺ کو تو کیا سمجھتا تھا؟ اگر ایمان دار ہو تو ان کے جواب دیتا ہے اور بے ایمان جواب نہیں دے سکتا اس پر بھی اقسام کے اعتراضات ہوتے تھے کہ مردے سے سوال کیسا؟ چونکہ معترضوں نے غلاف انسان

کوانسان سمجھ رکھا تھا اور اب ثابت ہوگیا کہ انسان کچھ اور ہی چیز ہے جس میں سوال وجواب کی اس حالت میں بھی صلاحیت ہے اس کے بعد اہل انصاف تو ہرگز جاہلانہ خیال نہیں کرسکتے کہ انسان اسی غلاف کا نام ہے جو کالبد انسانی ہے۔

اسی طرح سینہ اور دل کی حقیقت بھی ضرور کوئی دوسری چیز ہے اسی کو خیال کر لیجئے کہ اگر دل اسی گوشت کی بوٹی کا نام ہو جو ہر جانور میں ہے تو علوم حکمیہ اور غامض مسائل جو حکماء اور علماء کے دلوں میں جوش زن ہوتے ہیں جن کے عمدہ آثار وقتاً فوقتاً عالم میں ظہور پاتے ہیں تو وہ بوٹی دل کی جانوروں میں بھی ہے پھر کسی جانور سے ان کا ظہور کیوں نہیں ہوتا؟ میری دانست میں کوئی عاقل یہ باور نہ کرے گا کہ یہ لطیف غامض مسائل اس گوشت کی بوٹی میں رہتے ہیں، یہاں بھی یہی کہنا پڑے گا کہ یہ مضغۂ صنوبری دل کا غلاف ہے اور دل ایک لطیفۂ ربانی ہے کسی بزرگ کا قول ہے:

اگر یک قطرۂ دل برشگافی برون آید ازو صد بحر صافی

اسی طرح صدر کی بھی حقیقت دوسری ہے صرف ہڈیوں کا نام نہیں ہے گو اس حقیقت کا یہی مقام ہوگا اس لئے کہ حق تعالی فرماتا ہے فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّہٗ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ یعنی جس کی ہدایت کا ارادہ اللہ تعالی کرتا ہے اس کے سینہ کو اسلام کیلئے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے سینہ کو نہایت تنگ کردیتا ہے گویا کہ وہ آسمان میں چڑھ رہا ہے۔

یہ امر ظاہر ہے کہ اسلام لاتے وقت سینہ کی ہڈیاں پھیل نہیں جاتیں اور نہ کفر کی حالت میں ہڈیاں سمٹتی ہیں بلکہ کشادہ اور تنگ ہونے والا سینہ ہی دوسری ہے یہ ایک وجدانی امر ہے کہ ایمان والوں کے دل میں ایک وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور جو بات بات میں انقباض ہوا کرتا ہے کہ اگر ہم اپنا دین چھوڑ دیں گے تو لوگ کیا کہیں گے اور خلاف عقل باتیں ماننا لوگوں کی طعن و تشنیع کا باعث ہوگا کیا کہیں گے کہ اگر ان کو عقل ہوتی تو یہ لوگ خلاف عقل باتوں کو نہ مانتے اور یہ دلیل سفاہت اور حماقت کی ہے چنانچہ کفار اسی وجہ سے مسلمانوں کو سفہاء کہتے تھے اس کے سوا بڑا انقباض اس وجہ سے ہوتا ہے کہ تمام کنبہ کے لوگ اور احباب دشمن ہوجائیں گے غرضکہ اس قسم کے جتنے اسباب تنگدلی اور انقباض کے ہوتے ہیں سب دفع ہوجاتے ہیں اور سینہ میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور سب کو قبول کرلیتا ہے اور شرح صدر کے بعد جو کام ان سے لیا جاتا ہے نہایت خوشی اور کشادہ دلی سے کرتے ہیں اگر مال دینے کو کہا جائے تو نہایت ممنونیت سے امتثال امر کرتے ہیں چنانچہ صحابہؓ کے حالات سے ظاہر ہے کہ صرف چندہ کے لئے ارشاد نبوی ہوا تھا بعض حضرات نے اپنا نصف مال حساب کرکے حاضر کردیا اور بعض نے پورا کا پورا اگر جان دینے کو کہا جائے تو اس کو سعادت سمجھتے ہیں چنانچہ صحابہؓ کے حالات سے ظاہر ہے کہ جان بازی کے شوق میں ہر ایک چاہتا تھا کہ دوسرے سے بڑھا رہوں یہاں تک کہ ان کو روکنے کی ضرورت ہوتی تھی جب مال اور جان دینے میں تنگدلی نہ ہو تو دوسرے اسلامی کاموں میں کیونکر ہوسکتی ہے؟ یہ برکت شرح صدر کی ہے کہ جن کو

ہدایت کرنا منظورالٰہی ہوتا ہے ان کا سینہ کشادہ کردیا جاتا ہے۔

بخلاف اس کے جن کو گمراہ کرنا منظور ہوتا ہے اسلامی کاموں میں ان کا سینہ تنگ کردیا جاتا ہے جان اور مال دینا تو بڑی چیز ہے پانچ وقت کی نماز پڑھنی مشکل ہوتی ہے، سورو پیہ ایک سال رہیں تو ان میں سے ڈھائی روپیہ زکاۃ کے غریب قرابت دار اور مساکین کو دینا سخت دشوار ہوتا ہے حالانکہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ اس سے زیادہ روپیہ خیرات ہی میں صرف کردیتے ہیں مگر زکاۃ کے نام سے دینے میں ان کو تنگدلی ہوتی ہے اب کہئے وَمَنْ يُرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا اس موقع میں صادق آتا ہے یا نہیں یہ تو عوام الناس کا حال تھا اس آخری زمانے کے بعض خاص خاص لوگ بھی اسی دائرہ میں نظر آئیں گے۔

مشکاۃ شریف میں عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: ایک بار ہم لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا جس کا لباس نہایت سفید اور بال نہایت سیاہ تھے سفر کا کوئی اثر اس پر نہ تھا اور ہم میں سے کوئی شخص اسے پہچانتا بھی نہ تھا،، حضرت کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گیا اور دونوں زانو پر ہاتھ رکھ کر کہا: اے محمد (ﷺ) مجھے خبر دیجئے کہ اسلام کیا چیز ہے؟ حضرتؐ نے فرمایا! ''اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ کوئی معبود سوائے اللہ کے نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور نماز پڑھو اور زکاۃ دو، اور رمضان کے روزے رکھو، اور طاقت ہو تو حج کرو''، کہا: آپ سچ کہتے ہیں ہمیں تعجب ہوا کہ سوال بھی کرتا ہے اور خود ہی تصدیق بھی کرتا ہے! پھر کہا کہ: یہ

بتائیے کہ ایمان کیا چیز ہے؟ حضرت ﷺ نے فرمایا: ''یہ کہ خدائے تعالی کی ذات اور ملائکہ اور اسکی کتابوں اور پیغمبروں کا یقین کرنا اور خیر و شر اللہ ہی کی طرف سے سمجھنا'' کہا آپ سچ کہتے ہیں! پھر کہا: یہ بتائیے کہ احسان کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ: اس طرح عبادت کرو کہ گویا اللہ کو تم دیکھ رہے ہو اور اگر تم نہیں دیکھتے تو وہ تو دیکھ رہا ہے'' کہا آپ سچ کہتے ہیں! پھر اس نے قیامت کے حالات دریافت کئے جب وہ شخص چلا گیا تو حضرت نے پوچھا: اے عمرؓ تم جانتے ہو کہ یہ کون تھے؟ میں نے کہا اللہ و رسول دانا تر ہیں! فرمایا وہ جبرئیل تھے تمہیں دین کی تعلیم دینے کے لئے آئے تھے۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہے کہ ''اسلام'' احکام ظاہری بجالانے کا نام ہے اور احکام ظاہری بجالانے میں جس کا دل تنگ ہو تو آیت مذکورہ سے ثابت ہے کہ خدائے تعالی کو اس کی ہدایت مقصود نہیں کیونکہ صاف ارشاد ہے فَمَنْ یُرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ یُرِدِ اَنْ یُّضِلَّہٗ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا.

''ایمان'' و ''احسان'' میں ''اسلام'' کی ضرورت:

اب اس کے بعد کوئی یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ ہم درجہ احسان میں ہیں اس لئے عبادت ظاہری کی ہمیں ضرورت نہیں کیونکہ جب نص قطعی سے ثابت ہے کہ جس پر

عبادت ظاہری آسان نہ ہوتو یہ سمجھا جائے گا کہ خدائے تعالی اس کوگمراہ کرنا چاہتا ہےاور جس کوخدائے تعالی گمراہ کرنا چاہے ممکن نہیں کہ اس کو ہدایت اورتقرب الہی حاصل ہوسکے الحاصل جوعبادت مفروضہ سے محروم ہے وہ درجۂ احسان سے بالکلیہ محروم ہے ،جبرئیلؑ جوتعلیم امت کے لئے بارگاہ الہی سے مامور ہوکر آئے تھے ان کی پہلی تعلیم اسلام سے متعلق تھی جس کے معنی گردن نہادن اورفرمانبرداری کے ہیں اس کے بعد ایمان کی تعلیم مقصود تھی اس کے بعد احسان کی تعلیم ۔

اس سے ظاہر ہے کہ دین میں ابتدائی درجہ اسلام ہےاورانتہائی درجہ احسان کا ہے ،ابتدائی درجہ کا وجود دوسرے دونوں درجوں میں ضروریات سے ہے کیونکہ ایمان کے درجہ میں اگرآدمی بطورخودکسی بات پرایمان لائےتو اس کو بجائے ایمان دار کے بے ایمان کہنا چاہئے ،ایمان کے درجہ میں اسی قسم کا ایمان ہونا چاہئے جوقرآن وحدیث سے ثابت ہے یعنی اس ایمان کے وقت آیات واحادیث کی فرمانبرداری کی ضرورت ہے مثلاً خدائے تعالی کی ان صفات پرایمان لائے جوشریعت سے ثابت ہیں اگراس میں تصرف کرے اور یہ کہے کہ فلاں صفت میں یہ قباحت لازم آتی ہے اس لئے اس باب میں فرماں برداری نہیں کرسکتا تو ایسا ایمان جس کو اسلام سے تعلق نہیں وہ ایمان نہیں ہوسکتا اسی طرح احسان کے درجہ میں جوارشاد ہے وَاعْبُدْ رَبَّکَ اگراسلام نہ ہویعنی یہ کہے کہ فلاں عبادت جس کا حکم خدا ورسول نے دیا ہے میں نہ کروں گا اور اس میں مجھے فرماں برداری کی ضرورت نہیں تو اس کو درجہ احسان سے تعلق نہیں،غرضکہ اسلام یعنی

فرماں برداری خداورسول دین کے تمامی مدارج می ضروریات سے ہے،اسی وجہ سے ارشادباری تعالی ہورہاہے فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۔

''جنّ'' کاوجودہرملت ومذہب میں ثابت ہے چنانچہ دائرۃ المعارف میں معلم بطرس بستانی نے لکھاہے کہ: جتنے مذاہب انبیاء کی تصدیق کرتے ہیں وہ سب جن کے وجودکو مانتے ہیں اورقدمائے فلاسفہ اوراصحاب روحانیات بھی ان کے وجودکے قائل ہیں ان کی پیدائش کی نسبت حق تعالی فرماتاہے وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ یعنی جن کوہم نے انسان سے پہلے سموم کی آگ سے پیداکیاسموم اس گرم ہوا کرکہتے ہیں جوآدمی کے جسم میں سرایت کرتی ہے تفسیرکبیرمیں لکھاہے کہ سموم میں آگ ہوتی ہے اس کوسموم کہنے کی یہ وجہ ہے کہ بسبب کمال لطافت کے آدمی کے مسامات میں گھستی ہے اورابن مسعودؓ کاقول نقل کیاہے کہ یہ سموم جوبہاکرتی ہے وہ سترحصوں میں سے ایک حصہ اس سموم کاہے جس میں جن پیداہوئے ہیں الحاصل سموم میں جوآگ پوشیدہ ہوتی ہے اس سے حق تعالی نے جن کوبنایا۔

توضیح اس کی اس طرح کی جاسکتی ہے کہ خالص آگ جہاں مشتعل ہوتی ہے وہاں ایک خاص حدتک آگ محسوس ہوتی ہے جس کوزبانۂ آتش کہتے ہیں اوراس میں جلانے کی صفت بھی محسوس ہوتی ہے کپڑاوغیرہ اس پررکھاجائے توجل کرخاکِ سیاہ ہوجاتاہے اس حدکے بعداس آگ کااستحالہ ہواکی طرف ہوجاتاہے یعنی وہ ہوابن جاتی ہے،مگرایک حدتک اس ہوامیں گرمی ضروررہتی ہے اسی حدمیں جس قدرگرمی محسوس ہے

وہ آگ کی گرمی ہے یہی گرم ہوا جب بہہ کر آدمی کے مسامات میں گھس جاتی ہے تو ہلاک کر دیتی ہے، یہ مہلک گرمی آگ کی ہے کیونکہ جو حرارت کیفیتِ ہوا ہے وہ مہلک نہیں بلکہ مفرح اور روح کو تازہ کرنے والی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سموم میں آگ ہوتی ہے اور اسی آگ سے جنّ پیدا کئے گئے جس طرح مٹی سے انسان پیدا کئے گئے بظاہر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ انسان مٹی سے کیونکر پیدا ہوا کیونکہ ظاہراً اس کی تخلیق اس پانی کے اندر موجود اجزاء سے معلوم ہوتی ہے جو انسان سے خارج ہوتا ہے مگر چونکہ انسان کے حالات ہمیشہ ہمارے پیش نظر ہیں اس لئے غور وفکر کرنے سے معلوم ہوگیا کہ دراصل انسان کی تخلیق خاک سے ہے جس کا حال ہم نے مقاصدالاسلام کے حصہ ہفتم میں لکھا ہے۔

باوجود اس علم کے کیفیتِ تخلیق میں عقل حیران ہوتی ہے کہ مٹی کے استحالات جو ہوتے گئے وہ کیونکر ہوئے؟ یہ بات اور ہے کہ عادت ہونے کی وجہ سے حیرانی نہیں ہوتی مگر خاک کا نبات اور نبات کا اخلاط اور اخلاط کا نطفہ اور پھر علقہ اور مضغہ بن جانا عقل کی راہ سے ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتا کہ یہ قلبِ ماہیت کیونکر ہوتی گئی؟ خاک پر کس نے جبر کیا کہ اپنی صورت نوعیہ کو چھوڑ کر نباتی صورت اختیار کرے اور وہ خاصیتیں اور تاثیرات اس میں آجائیں جو خاک میں نہ تھے؟ اور جسم نباتی وحیوانی پر ایسی کونسی چیز مسلط ہوئی جس نے ان کی صورت نوعیہ کو دور کر کے خلطی صورت پہنادی؟ اب اگر کہیں کہ صورت نباتی خلط میں موجود ہے تو بداہت کے خلاف ہے کیونکہ اخلاط میں اس قسم کا

جسم ہے نہ رنگ نہ بو ہے نہ مزہ وغیرہ اور اگر کہیں کہ صورت نباتی فنا ہوگئی تو وہ خاصیتیں اور تاثیرات جو اس میں نہیں تھیں کہاں سے آ گئیں؟ کیونکہ کل لوازم وآثار صورت نوعیہ سے متعلق ہیں مثلاً دماغ کی قوت کے لئے جو دوائیں دی جاتی ہیں جب تک وہ دماغ میں نہ جائیں تاثیر ممکن نہیں اور دماغ میں جانے والی اس کی غذا بلغم وغیرہ ہے جس کی صورت نوعیہ ان ادویہ کی صور نوعیہ سے بالکل جدا اور ممتاز ہے۔

بہر حال اس سلسلہ کے انقلابات اور استحالات کو اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو ضرور عقل حیران ہوتی ہے اور جب تک اس کے قائل نہ ہوں کہ خالق عالم نے جس طرح خاک کو اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمایا اسی طرح صورت نوعیہ کو دور کر کے صورت ثانیہ اس کو دی علی ہذا القیاس یکے بعد دیگرے انقلابات ہوتے گئے یہاں تک کہ آخر میں صورت انسانی کی خلعت فاخرہ اس کو پہنائی گئی اسی پر قیاس کر لیجئے کہ ہر چیز کی تخلیق میں ابتداء کچھ ہوتی ہے اور انتہاء کچھ یہ ضروری نہیں کہ جو صورت ابتدائی ہو اس کے پورے لوازم وآثار باقی رہیں دیکھئے انسان خاک سے پیدا ہوئے اور اس سے ان کو کوئی مشابہت نہیں۔

ان امور پر غور نہ کر کے اقسام کے اعتراض کئے جاتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ:

نار ایک لطیف چیز ہے اگر جن اس سے پیدا ہوئے ہوں تو ان کی قوت سے متعلق جو حکایات مشہور ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آدمی سے زیادہ وزن اٹھا سکتے ہیں درست نہ ہوگا کیونکہ جس کی جسامت زیادہ ہوگی اس کی جسمانی قوت بھی زیادہ ہوگی یہ سب

''قیاس الغائب علی الشاھد'' ہے جو بالکل صحیح نہیں جس چیز کی تخلیق خدائے تعالی فرماتا ہے وہ نرالی ہوتی ہے، دیکھئے افلاک کے نسبت حکماء نے تصریح کی ہے کہ نہ وہ گرم ہیں نہ سرد نہ ثقیل نہ خفیف، اب کہئے کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی چیز خفیف بھی نہ ہو اور ثقیل بھی نہ ہو! آگ ہر چیز کو جلاتی ہے مگر ابرک کو نہیں جلا سکتی، سونے چاندی اور فولاد کو سیال بناتی ہے مگر انڈے کی زردی اور سفیدی کو جو سیال ہے منجمد کر دیتی ہے۔

غرضکہ ہر ایک چیز میں حق تعالی نے ایک قسم کی صلاحیت دی ہے اور اس کے لوازم و آثار مقرر فرمائے ہیں جن کا صدور ضروریات سے ہے اسی طرح جن کو بھی نار سموم سے پیدا کر کے ان کے لوازم و آثار مقرر کر دئے مثلاً ہر شکل میں متشکل ہونا نظروں سے عموماً غائب رہنا اور کبھی بعض بعض لوگوں کو نظر آجانا تھوڑے وقت میں مسافت بعیدہ کو طے کرنا انسان کے جسم میں حلول کرنا وغیرہ ہم نے مقاصد الاسلام کے دوسرے حصہ میں کتب حکمت جدیدہ سے جن کا وجود بفضلہٖ تعالی ثابت کر دکھایا ہے اگر وہ تقریر دیکھ لی جائے تو اہل انصاف کو غالباً جن کے وجود میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے گا۔

سرقۂ جسم انسانی:

علامہ فرید وجدی نے کنز العلوم واللغۃ میں لکھا ہے کہ: یہ امر مکرر تجربات اور تحقیقات سے یورپ میں مسلم ہو چکا ہے کہ روحیں (جن) بلائے جاتے ہیں اور وہ بالکل

آدمی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں چنانچہ ان میں گوشت خون ہڈی وغیرہ بھی موجود رہتے ہیں اور جب ان سے دریافت کیا گیا کہ یہ اشیاء تم میں کہاں سے آگئے تو انہوں نے خبر دی کہ یہ سب عاریتی ہیں اس شخص سے لیتے ہیں جو ہمیں بلاتا ہے چنانچہ بلانے والے کا وزن کیا گیا تو فی الواقع اس کا نصف وزن کم تھا اور ان کے جانے کے بعد جب تولا گیا تو اس کا اصلی وزن پورا ہو گیا دیکھئے ان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی کہ آدمی کی ہڈی اور گوشت وغیرہ چرالیں اور اس کو خبر نہ ہونے پائے!! یہ بات نہ آدمی کو دی گئی نہ کسی جانور کو اب کہاں ہے وہ قاعدہ جو ہزارہا اطباء کے تجربوں اور اقوال ثابت تھا کہ اذیت کا باعث تفرق اتصال ہے! یہاں تو سر سے پاؤں تک ہر ہر ہڈی گوشت وغیرہ میں تفرق اتصال ہو گیا! اور وہ بھی کیسا کہ صرف تفرق ہی نہیں بلکہ ہر ایک چیز آدھی ہو کر جسم سے باہر نکل گئی اور پوست صحیح وسالم رہا اور خبر بھی نہ ہوئی کہ کوئی چیز اپنے جسم سے خارج ہوئی یا نہیں! کیونکہ گوشت اور پوست اپنی حالت سابقہ پر ہے اگر ہڈی باہر نکل جاتی تو گوشت اور پوست ضرور پھٹتا جس سے ایک دوسرا تفرق اتصال ہو کر اذیت پر اذیت ہوتی!! اب کہئے کہ اس قسم کی چوری کیا کوئی انسان یا حیوان کرسکتا ہے؟

یہ طریقہ خاص جن ہی سے متعلق ہے اس قسم کے صدہا عجائبات ان سے ظہور میں آتے ہیں چنانچہ لکھا ہے کہ: جب کبھی کوئی نیا تجربہ کیا جاتا ہے تو نئ نئ باتیں دیکھنے میں آتی ہیں جن سے عقل حیران ہو جاتی ہے۔

یہاں یہ امر خاص توجہ کے لائق ہے کہ جس انسان سے ہڈی گوشت وغیرہ چرایا

گیا اس کا وجدان گواہی دیتا ہے کہ جس قدر جسم چوری سے پہلے اپنے پاس تھا اب بھی ہے کوئی جزو اس میں سے کسی دوسرے کے جسم میں نہیں گیا اور حس بھی گواہی دیتی ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں اور عقل بھی گواہی دیتی ہے کہ کوئی جزو اندر سے باہر چلا نہیں گیا ورنہ حس کا امان جاتا رہے گا جس سے لازم آئے گا کہ کوئی دلیل ثابت نہ ہونے پائے کیونکہ جب تک نظریات کی انتہاء بدیہیات پر نہ ہو وہ ثابت نہیں ہو سکتے پھر جب حواس ہی کا اعتبار نہ رہے اور یہ مسلم ہو جائے کہ وہ اپنے کاموں میں غلطی کرتے ہیں مثلاً آدھا جسم کوئی آنکھوں کے سامنے سے چرا لے گیا اور ان کو خبر بھی نہ ہوئی حالانکہ سوئی کے چبھنے سے ایک بال برابر جسم میں تفرق اتصال ہو جاتا ہے تو سر سے پاؤں تک بیقراری ہوتی ہے بمصداق شعر:

چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضو را نماند قرار

جب سر سے پاؤں تک ہر ایک عضو میں تفرق اتصال ہو جائے اور قوت احساسی کو خبر تک نہ ہو تو کہئے کہ اب کس چیز پر بھروسہ ہو سکے؟! عقل اس قابل نہ تھی کہ اس پر بھروسہ کیا جائے کیونکہ نظر و فکر میں ہمیشہ غلطیاں ہوا کرتی ہیں اسی وجہ سے کوئی عقلی مسئلہ ایسا نہیں جس میں عقلاء کا اختلاف نہ ہو صرف حواس اعتبار کے قابل سمجھے جاتے تھے جب ان کا بھی یہ حال ہو تو اب کس چیز کے اعتماد پر کوئی بات ثابت ہو سکے غرضکہ یہاں وجدان حس اور عقل کی گواہی سے پورا جسم اپنے مقام میں رہنا ثابت ہے اور آدھے جسم کا غائب ہو جانا بھی مشاہدے سے ثابت ہو گیا تو اب عقل سے پوچھا جائے

ان دونوں صورتوں میں کونسی صورت اختیار کی جائے گی؟ جو کوئی اختیار کی جائے اس کے مقابلہ میں دوسری صورت موجود ہے جو اعتبار میں اس سے کم نہیں۔

دائرۃ المعارف میں فاضل فرید وجدی نے لکھا ہے کہ: یہ مسئلہ امریکہ میں ۱۸۴۶ء میں اور یورپ میں شائع ہونے لگا تو ہر طرف چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں ، مادیین کے الحاد و زندقہ کا مدار اس ہٹ دھرمی پر تھا کہ اگر جن موجود ہیں یا ارواح بعد موت باقی رہتی ہیں تو بتائی جائیں؟ اور اہل مذہب بتا نہیں سکتے تھے اور اب یہ دعوی سے کہا جا رہا ہے اور دعوتیں دی جا رہی ہیں کہ جن کو وجود جنات و ارواح میں شک ہو تو آ کر دیکھ لیں! تو اب اہل مذہب کے مقابلے میں مادیین حیران و مضطرب ہیں اور کبھی زچ ہو کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور سخت وسست کہنے لگتے ہیں یہاں تک کہ مار پیٹ بلکہ جدال وقتال کی تک نوبت پہونچ جاتی ہے مگر تا بہ کے؟ آخر اہل انصاف مسلسل اور بار بار کے مشاہدات سے قائل ہوتے جاتے ہیں چنانچہ اس وقت لاکھوں علمائے یورپ نے مان لیا کہ ارواح و جن کے وجود میں اب کوئی کلام نہیں ہوسکتا اور ان کے احوال وافعال میں عقل بالکلیہ حیران ہے جس کا جسم چرایا جائے وہ سمجھتا ہے کہ میرا جسم میرے پاس موجود ہے اور حالانکہ اس کا جسم اس جن کے پاس ہے اور دونوں جگہ کام دے رہا ہے!!

اولیاءاللہ کا بیک وقت واحد کئی جگہ موجود رہنا:

جب یہ مشاہدہ سے ثابت ہو گیا اور لاکھوں عقلاء نے اس کو تسلیم کر لیا تو ان وقائع کے

انکار کی کوئی وجہ نہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ وقت واحد میں کئی جگہ جاسکتے ہیں امام سیوطیؒ نے ''القول المنجلی فی تطور الولی ''میں لکھا ہے کہ: ایک مسئلہ میرے پاس پیش ہوا کہ ایک مجلس میں کسی نے کہا: آج رات شیخ عبدالقادر طجطوطیؒ میرے یہاں تشریف لائے تھے اور رات بھر وہیں رہے! دوسرے نے کہا کہ یہ کیا کہتے ہو وہ تو رات بھر میرے یہاں تھے! اس نے کہا غلط کہتے ہو! غرض کہ طرفین سے گفتگو بڑھی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ دونوں نے قسم کھائی کہ اگر وہ بزرگ گزشتہ رات میرے یہاں نہ تھے تو میری بیوی پر طلاق! اور فیصلہ اس پر ٹھہرا کہ خود ان ہی حضرت سے پوچھا لیا جائے کہ آپ گزشتہ رات کہاں تھے؟ جب پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر چار شخص بھی دعوی کریں کہ میں ان کے پاس تھا تو وہ صحیح ہے! علماء میں گفتگو شروع ہوئی کہ کس کی بیوی پر طلاق واقع ہوئی؟ امام سیوطیؒ نے یہ فیصلہ دیا کہ کسی پر طلاق نہیں ہوئی کیونکہ ایک شخص وقت واحد میں کئی مقامات میں کرامت سے رہ سکتا ہے۔

اس کے بعد اسی میں لکھا ہے کہ تاج الدین سبکیؒ نے طبقات الشافعیہ الکبری میں ابوالعباسؒ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ صاحب کرامات تھے ان کے شاگرد عبدالغفار اپنی مصنفہ کتاب ''وحید التوحید'' میں لکھتے ہیں کہ جمعہ کے روز ہم شیخ کی خدمت میں حدیث پڑھ رہے تھے اور ان کی باتوں پر ہمیں لذت حاصل ہورہی تھی ایک لڑکا وضو کرنے لگا شیخ نے کہا: اے مبارک کہاں جاؤ گے؟ کہا مسجد کو! فرمایا: قسم ہے میں نے نماز پڑھ لی! لڑکا جب مسجد کو گیا تو لوگ نماز پڑھ کے مسجد سے نکل رہے تھے عبدالغفار کہتے

ہیں کہ میں نے بھی نکل کرلوگوں سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ شیخ ابوالعباس مسجد میں ہیں اورلوگ ان پر سلام کررہے ہیں ! یہ سن کر میں نے شیخ کے پاس آ کر حال دریافت کیا؟ فرمایا کہ: مجھے قوتِ تبدّلِ صورت دی گئی ہے۔

اورلکھا ہے کہ صفی الدین بن ابی المنصور نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ شیخ مفرج کا عجیب واقعہ یہاں گزرا کہ ایک شخص نے حج سے آ کر اپنے احباب میں ذکر کیا کہ شیخ مفرج کو میں نے عرفات میں دیکھا دوسرے نے کہا کہ وہ تو دمائین سے کہیں نہیں گئے ! دونوں میں گفتگو یہاں تک بڑھی کہ ایک نے قسم کھائی اور کہا اگر میں جھوٹ کہہ رہا ہوں تو میری عورت پر طلاق ! دونوں نے شیخ کے پاس جا کر کہا کہ ہم دونوں نے اس معاملہ میں طلاق کی قسم کھائی ہے؟ فرمایا کسی کی عورت پر طلاق نہیں پڑی میں نے پوچھا کہ جب ایک شخص سچا ہے تو دوسرے کی عورت پر ضرور طلاق پڑنی چاہئے ؟ اس وقت مجلس میں بہت سے علماء حاضر تھے، شیخ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں تم لوگ گفتگو کرو! ہر ایک نے اپنی اپنی رائے بیان کی مگر تشفی نہ ہوئی آخر میں مجھ سے فرمایا کہ تم وضاحت سے بیان کرو! میں نے کہا جب کسی کی ولایت متحقق ہو جاتی ہے تو وہ ہر صورت کے ساتھ مشکل ہوسکتا ہے اور اپنی روحانیت کی وجہ سے متعدد جہات میں وقت واحد میں جاسکتا ہے اور یہ سب کام اس کے ارادہ سے ظہور میں آتے ہیں اس وجہ سے جو صورت کہ عرفات میں دیکھی گئی حق تھی اور جو صورت کہ دمائین میں دیکھی گئی وہ بھی حق تھی شیخ نے فرمایا یہی بات صحیح ہے۔

اور امام یافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اس قسم کی بات بعید نہیں ہے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ کعبہ معظّمہ کو لوگوں نے دیکھا ہے کہ بعض اولیاء اللہ کے طواف کے لئے گیا حالانکہ اس وقت وہ مقام سے منتقل نہیں ہوا تھا اور لکھا ہے کہ شیخ خلیل مالکی جو امام سمجھے جاتے تھے اور جلالت شان ان کی مسلم ہے انہوں نے لکھا ہے کہ ایک جماعت سے منقول ہے کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ کعبۃ اللہ نے بعض اولیاء اللہ کا طواف کیا ہے۔

اور لکھا ہے کہ بعض بزرگوں سے ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ لوگ جو ہوا پر اڑنے کو بڑی بات سمجھتے ہیں وہ کوئی بڑی بات نہیں البتہ بڑی بات یہ ہے کہ ایک شخص مشرق میں ہو اور دوسرا شخص مغرب میں اور دونوں کو باہمی ملاقات کی خواہش ہو اور دونوں ایک جگہ جمع ہوں اور ملاقات کر کے واپس آجائیں اور لوگ ان کو اپنے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے دیکھیں یعنی اپنے مقاموں میں بھی موجود رہیں اور دوسری جگہ بھی جائیں۔

اور لکھا ہے کہ امام یافعیؒ نے روض الریاحین میں ذکر کیا ہے کہ ایک شخص حج سے فارغ ہو کر جب گھر آیا تو باتوں باتوں میں اپنے بھائی سے کہا کہ اس سال سہل ابن عبداللہ تستریؒ بھی حج میں شریک تھے اور عرفات کے موقف میں میں نے انہیں دیکھا! بھائی نے کہا وہ تو یوم الترویہ یعنی ذی الحجہ کی آٹھوی تاریخ اپنی رباط میں تھے جو تستر کے دروازہ پر ہے! اس نے کہا کہ میں نے ان کو عرفات میں ضرور دیکھا ہے اگر یہ خلاف واقعہ ہے تو میری عورت پر طلاق! دونوں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کیا، شیخ نے تصدیق کر کے کہا ان امور کی دریافت کرنے کی ضرورت نہیں اور قسم کھانے

والے سے فرمایا کہ تمہاری عورت پر طلاق نہیں ہوئی مگر کسی سے یہ حال بیان نہ کرنا۔

اور لکھا ہے کہ شیخ خلیل مالکیؒ نے بھی اپنی کتاب میں شیخ عبداللہ متوفی کا بھی ایک ایسا ہی واقعہ ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ شیخ ابو العباس موسیٰؒ کے حال میں لکھتے ہیں کہ کسی شخص نے آپ کو جمعہ کے روز بعد نماز جمعہ اپنے گھر بلایا آپ نے قبول کیا، اس کے بعد یکے بعد دیگرے پانچ شخصوں نے جمعہ کے بعد اپنے گھر آنے کو کہا آپ نے سب کو اچھا کہا، جب جمعہ کی نماز سے فارغ ہوئے تو اپنے مکان میں تشریف لا کر فقراء کے ساتھ حسب عادت تشریف رکھی اور کہیں نہ گئے، اس کے بعد پانچوں نے آ کر تشریف فرمائی کا شکریہ ادا کیا۔

اور لکھا ہے کہ شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ کے شاگردوں میں سے ایک شخص حج کو گیا جب واپس آیا تو شیخ کا حال دریافت کیا لوگوں نے کہا خیریت سے ہیں، پھر کہا وہ بھی اس سال حج میں شریک تھے چنانچہ میں نے شیخ کو مطاف اور مسعی و عرفات وغیرہ مقامات میں دیکھا لوگوں نے کہا وہ تو یہاں سے کہیں نہیں گئے وہ شخص شیخ کی ملاقات کو گیا شیخ نے اثنائے کلام میں پوچھا کہ سفر میں کن کن بزرگوں کو تم نے دیکھا؟ کہا حضرت میں نے تو آپ کو بھی دیکھا ہے! شیخ نے تبسم فرمایا۔

اور لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؓ سے قضیب البان موصلیؒ کا حال دریافت کیا گیا؟ فرمایا وہ ولی مقرب وصاحبِ حال وقدمِ صدق ہیں کسی نے کہا ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے نماز پڑھی ہو! فرمایا وہ وہاں نماز پڑھتے ہیں کہ تم ان کو نہیں دیکھ

سکتے میں انہیں دیکھتا ہوں کہ موصل میں یا اور کسی شہر میں نماز پڑھتے ہیں تو وہ باب کعبہ پر سجدہ کرتے ہیں ابوالحسن قرشی کہتے ہیں کہ میں ایک بار قضیب البانؒ کی ملاقات کو گیا دیکھا کہ ان کا جسم اس قدر بڑا ہے کہ تمام گھر ان سے بھر گیا میں یہ دیکھ کر ڈر گیا پھر جب دوبارہ گیا تو دیکھا کہ وہ اپنی اصلی حالت پر ہیں۔

اور لکھا ہے کہ شیخ برہان الدین انباسیؒ نے اپنی کتاب ''تلخیص الکواکب المنیرۃ'' میں لکھا ہے کہ جب شیخ ابوالعباسؒ مکہ معظّمہ کو گئے تو حرم شریف میں شیخ ابو الحجاج اقصری سے ملاقات ہوئی اور اولیاءاللہ کا ذکر خیر دیر تک ہوتا رہا ابوالحجاجؒ نے کہا کیا طواف کعبہ کی خواہش ہے؟ ابوالعباس نے کہا کہ خدائے تعالی کے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ اس کا گھر ان کا طواف کرتا ہے ابوالحجاج نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو فی الواقع بیت اللہ ان دونوں کے اطراف طواف کر رہا ہے، انباسیؒ نے لکھا ہے کہ یہ کوئی انکار کے قابل بات نہیں اس کی نظیریں اخبار صالحین میں بہت سی ملتی ہیں۔

اور لکھا ہے کہ ابن قیمؒ کتاب الروح میں لکھتے ہیں کہ: روح کی وہ شان ہے جو بدن کو حاصل نہیں چنانچہ رفیق اعلی میں رہتی ہے اور اسی حالت میں بدن کے ساتھ بھی اس کو اتصال ہوتا ہے اس طور پر کہ جب اس پر سلام کیا جائے تو جواب سلام دیتی ہے۔

جب یہ بات مسلم ہوئی کہ کرامت سے ایک شخص متعدد مقامات میں رہ سکتا ہے تو اس سے ایک بہت بڑا فائدہ حاصل ہوا وہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ ایک ایک جنتی کو اتنے باغ دیئے جائیں گے جو زمین وآسمان کے برابر ہوں مطلب

یہ کہ تمام روئے زمین کی سلطنت کے مساوی ہر شخص کو وہاں سلطنت دی جائے گی اور یہ ظاہر ہے کہ آدھی بلکہ پاؤ زمین بھی سرسبز نہیں ہے اور اس میں باغ تو شاید لاکھواں حصہ بھی نہ ہوں گے بخلاف جنت کے کہ اس کی شان میں حق تعالی نے فرمایا ہے وَجَنّٰتٍ اَلْفَافاً یعنی کثیر اشجار والی جنتیں! پھر صرف باغات ہی نہیں بلکہ عیش وعشرت کے جملہ سامان موقع موقع پر مہیا اور موتیوں وغیرہ کے محل اور ان میں حور وغلمان وغیرہ موجود ہوں گے غرضکہ ایک شخص کے واسطے ایک اتنا بڑا ملک جس کی شان میں حق تعالی وَمُلْکاً کَبِیْراً فرماتا ہے معین فرمایا گیا، اگر تھوڑی تھوڑی دیر ایک ایک خطہ اور مکان میں سیر وتفریح ہو تو تمام ملک کی گشت کرنے کے لئے ایک مدت دراز درکار رہے پھر جس چیز کو دیکھئے دلچسپ ودل فریب اور قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی مقام یا کوئی چیز پسند آجاتی ہے تو اس کے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا:

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

اس لحاظ سے تو ہر مقام اور ہر چیز اپنے ہی پاس اقامت کرنے پر مجبور کرے گی ،اور تمام سلطنت کی اشیاء کا وجود اس شخص کے حق میں بیکار ہوگا، حالانکہ وہاں کی کل اشیاء خاص اسی کے انتفاع کے لئے ہیں مگر جب ہمیں معلوم ہوا کہ کرامت سے ایک آدمی اس عالم میں متعدد مقامات میں بوقت واحد رہ سکتا ہے تو جنت تو خاص ''دارالکرامت'' ہے وہاں جس قدر کرامات اور اقتدارات مسلمانوں کو دیئے جائیں گے ان کا شمار ہی نہیں اس صورت میں یہ بات بہت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہر مقام میں جنتی اپنی ذات

سے رہ سکے گا اور کوئی چیز اس کے حق میں بیکار ثابت نہ ہوگی۔

پل صراط کا باریک اور ایک وادی ہونا:

یہاں ایک اور مسئلہ حل ہوگیا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ پل صراط بعض کے واسطے بال سے باریک ہوگا اور بعض کے حق میں کشادہ میدان کیونکہ یہ ثابت ہوگیا کہ ایک معین چیز وقت واحد میں کئی مقامات میں ہوسکتی ہے پھر کیا تعجب ہے کہ ایک مقام میں نہایت باریک ہو اور دوسرے مقام میں نہایت وسیع اور دونوں بوحدت شخصی ایک ہوں۔

جب جن کا وجود مشاہدہ سے ثابت ہوگیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے احوال نرالے ہیں انسانوں پر ان کا قیاس نہیں ہوسکتا تو اب ان مشاہدات سے انکار کی کوئی ضرورت نہ رہی جو متواتر ثابت ہیں کہ وہ کبھی نظر آتے ہیں اور ان کا مختلف صورتیں بدلنا محسوس ہوتا ہے مثلاً کتے یا بلی کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں پھر ساتھ ہی مہیب وقد آور آدمی بن گئے جب کوئی اپنے چشم دید واقعات اس قسم کے بیان کرتا تو کہا جاتا تھا یہ سب خیالی اور وہمی صورتیں ہیں جن کی خارج میں کوئی اصل نہیں! حالانکہ ان امور کی اصلیت اب ثابت ہوچکی ہے۔

اب بھی شاید بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ نہ آئے گا کہ اگر وہ ایسے اجسام ہیں

جو دکھائی نہیں دیتے تو پھر ان کا دکھنا کیسا ؟ اور اَشکال کے بدلے میں بڑے بڑے اِشکال پیدا ہوتے ہیں مگر غور کیا جائے تو اس کا سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں حق تعالی نے جس چیز کو پیدا کیا اس کے اوصاف واحوال خاص خاص قسم کے معین کئے جو ہمیشہ ایک طور پر دیکھے جاتے ہیں اس وجہ سے جب اس چیز کا خیال آئے گا تو وہی احوال واوصاف پیش نظر ہو جائیں گے۔

عادت اور خرق عادت:

دیکھئے اگر کوئی مسلمان ہمیشہ داڑھی منڈھواتا ہو تو جب کسی کو اس کا خیال آئے گا تو اس کے چہرہ کے ساتھ داڑھی کبھی خیال میں نہ آئے گی اور اگر بتکلف اس کا خیال کیا جائے تو وہ ایسا ہوگا جیسے کسی عورت کے چہرہ کے ساتھ داڑھی کا خیال کیا جائے، اگر چہ دونوں کی داڑھیوں میں فرق ہے عورت کی فطرت میں داڑھی نہیں رکھی گئی اور مرد کی فطرت میں داڑھی ہے، مگر بتکلف خواہ اس خیال سے کہ عورتوں کے ساتھ مشابہت ہو یا اور کسی وجہ سے وہ نکال دی گئی مگر دونوں تصور کے وقت اس بات پر برابر ہیں یعنی جس طرح عورت کے تصور کے وقت داڑھی خیال میں نہیں آتی اسی طرح اس مرد ریش تراش کے تصور کے وقت بھی داڑھی خیال میں نہ آئے گی کیونکہ عادت کی وجہ سے خیال اس کی داڑھی کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا! ہر چند اس کے چہرہ میں اس امر کی صلاحیت ہے کہ

داڑھی نکل آئے مگر اس کی تصوری صورت میں صلاحیت داڑھی کی نہیں ہے باوجود اس کے اگر اس پر یہ خیال غالب ہوجائے کہ ہمارے نبی کریم ﷺ خود داڑھی رکھتے تھے اور اس کے منڈھوانے سے منع فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ: جو شخص کسی قسم کی مشابہت پیدا کرے وہ اسی قوم میں ہوگا جس کے ساتھ اس نے مشابہت پیدا کی پھر آنحضرت ﷺ ہمارے افعال پر مطلع ہوتے ہیں اور بحسب اعتقاد اہل سنت ہمیں دیکھتے بھی ہیں جب حضرت ہماری صورتوں کو مخالفین اسلام کی طرح بے داڑھی دیکھتے ہوں گے تو کس قدر رنج ہوتا ہوگا کہ اپنی امت کے لوگ مخالفین میں شمار کئے جائیں !! اور قیامت میں حضرت کو کیا منہ بتائیں گے، غرضکہ اس قسم کے خیالات سے اگر وہ شخص داڑھی رکھ لے تو لوگوں کو تعجب ضرور ہوگا اور کوئی رودار شخص ہو تو اس کے احباب متحیر ہوکر دیکھنے آئیں گے ان میں دیندار لوگ مبارکباد دیں گے، اور جن کو دین سے چنداں تعلق نہیں وہ نفرت کریں گے، فرشتے جو مسلمانوں کے خیرخواہ ہیں خوش ہوں گے اور شیاطین ناخوش اور غمگیں، غرضکہ ترک عادت کی وجہ سے حیرت ضرور ہوگی، مگر یہ نہ سمجھا جائے گا کہ اس شخص کی داڑھی غیر ممکن تھی وہ تو مرد ہے بعض عورتوں کو بھی داڑھی نکلتی ہے، چنانچہ خود میں نے ایک داڑھی والی عورت دیکھی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کوئی مقتدر شخص کسی بات کی عادت کرلے تو یہ لازم نہیں آتا کہ اس عادت کو ترک کرنے پر وہ قادر نہ ہو جس طرح شخص ریش تراش ترک عادت پر قادر ہے۔

اسی طرح خدائے تعالی نے جن جن اشیاء میں ایک ایک عادت خاص طور پر

رکھی ہے اس عادت کوترک کرنے پر قادر ہے اسی کوخرق عادت کہتے ہیں،لوگوں نے خرق عادات ایک بڑی بات بنا رکھی ہے مگر دراصل خدائے تعالی کے نزدیک عادت اورخرق عادت دونوں برابر ہیں کیونکہ جب یہ امر مسلم ہے کہ خدائے تعالی نے پانی میں سردی اور آگ میں گرمی اپنے ارادے اور اختیار سے پیدا کی ہے تو اگر پانی میں گرمی اور آگ میں سردی پیدا کرے تو کون سی بڑی بات ہے؟ نفس تخلیق دونوں کی برابر ہے یہ ہرگز ثابت نہ ہوسکے گا کہ پانی کی صورت نوعیہ کوسردی کے ساتھ کوئی خصوصیت ہے اگر ایسا ہوتا تو وہ گرم کبھی نہ ہوتا حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں گرمی اس قدر پیدا ہوسکتی ہے کہ آگ کی طرح وہ بھی جلا دیتا ہے غرضکہ پانی کی سردی اور آگ کی گرمی صرف عادت کی وجہ سے خیال میں آتی ہے اس کوصورت نوعیہ سے کوئی ذاتی تعلق نہیں۔

اس تقریر کے بعد میری دانست میں یہ سمجھنا بہت آسان ہوجائے گا کہ ''جن'' کی تخلیق خاص طور پر جداگانہ ہے کوئی ضروری نہیں کہ آدمی کے پورے لوازم واوصاف ان میں بھی پائے جائیں اور آدمی پر ان کی قیاس کر کے ان کے خصوصیات سے انکار کردیا جائے۔

آکام المرجان میں لکھا ہے کہ حارث محاسبیؒ کا قول ہے کہ: مسلمان جن وانس جب جنت میں داخل ہوں گے تو آدمی جنوں کو دیکھیں گے اور جن آدمیوں کو نہ دیکھیں گے ،دیکھئے اس مقام کے لوازم وآثار ہی جدا ہوگئے کہ انسان کی بصارت میں ایسی صلاحیت دی جائے گی کہ جنوں کو دیکھ سکیں گے کیوں نہ ہو جب خدائے تعالی کی رؤیت

کی صلاحیت ان کے آنکھوں میں دی جائے گی تو جن کا دیکھنا کونسی بڑی بات ہے! حق تعالی فرماتا ہے وُجُوہٌ یَّومَئِذٍنَاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاضِرَۃٌ جس سے صاف ظاہر ہے کہ خدائے تعالی کی رؤیت جنت میں ہوگی اور احادیث میں اس امر کی تصریح ہے کہ وہاں حق تعالی کو اس طرح دیکھیں گے جیسے کہ کوئی چودھویں رات کے چاند کو دیکھتا ہے ،آکام المرجان میں ابن عبدالسلام کا قول نقل کیا ہے کہ رؤیت الٰہی صرف اور صرف مسلمان اور مؤمنوں کو ہوگی ان کے سوانہ جن کو ہوگی نہ ملائکہ کو، معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرف خاص انسان ہی کے واسطے ہے کیونکہ وہ خلیفۃ اللہ ہے جن کو دنیا میں بہت سی باتوں میں انسان پر فوقیت تھی اس کا معاوضہ آخرت میں اسی وجہ سے دیا گیا کہ ان تمام فضیلتوں سے جو وہاں دی جائیں گی ابداً آباد متصف رہے۔

درازیِ عمرِ جن:

جنوں کی عمریں دراز ہوتی ہیں چنانچہ آکام المرجان میں لکھا ہے کہ عمر بن عبد العزیزؓ کسی جنگل میں جارہے تھے کہ ایک سانپ پر ان کی نظر پڑی جو مرگیا تھا انہوں نے اس کو کفن پہنا کر دفن کردیا غیب سے آواز آئی کہ: اے سرق میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ سے خود میں نے سنا ہے کہ تمہیں فرمارہے تھے کہ ''تم ایک جنگل میں مروگے اور ایک مرد صالح جو اس زمانہ میں بہترین اہل ارض سے ہوگا تمہیں کفن پہنا کر

دفن کرے گا عمر بن عبدالعزیز نے اس کہنے والے سے پوچھا کہ خدا تم پر رحم کرے تم کون ہو؟ کہا میں ایک جن ہوں ان جنوں میں سے جنہوں نے قرآن شریف رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا، ان لوگوں میں سے سوائے میرے اور سرق کے اب کوئی باقی نہیں اور سرق یہی ہے جس کو آپ نے کفن پہنا کر دفن کر دیا۔

دائرۃ المعارف میں معلم بطرس بستانی نے لکھا ہے کہ انس ؓ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ تھا جب حضرت ﷺ مکہ معظہ کے پہاڑوں سے گزر گئے تو ایک بوڑھے کو دیکھا کہ لکڑی ٹیکتا ہوا آرہا ہے آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا کہ یہ چال اور آواز جن کی ہے! اس نے کہا درست ہے، آپ نے فرمایا کہ: جن کے کس قبیلہ سے ہو؟ کہا صامہ بن الہیم بن لاقیس بن ابلیس، فرمایا اس سے تو معلوم ہوا کہ تجھ میں اور اس میں دو ہی پشت ہیں! کہا جی ہاں: فرمایا کتنی مدت تجھ پر گزری؟ کہا تقریباً ساری دنیا کو کھا گیا جس زمانے میں قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا اس وقت میں ٹیلول پر چڑھ کر دیکھتا اور لوگوں کو ورغلایا کرتا تھا، فرمایا یہ برا کام ہے کہا یا رسول عتاب نہ فرمایئے میں ان لوگوں میں سے ہوں جو نوح ؑ پر ایمان لائے میں نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی، اور ہودؑ سے ملا اور ان پر ایمان لایا، اور ابراہیمؑ سے ملا اور آگ میں ان کے ساتھ تھا، اور جب یوسف ؑ کنویں میں ڈالے گئے میں ان کے ہمراہ تھا، اور شعیب اور موسیٰ علیہما السلام سے ملاقات کی، اور عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی ملاقات سے مشرف ہوا انہوں نے مجھ سے کہا کہ: اگر محمد ﷺ سے ملاقات ہو تو میرا سلام ان کو پہونچانا، چنانچہ

یہ پیام میں نے آپ کو پہونچادیا اور آپ پر ایمان لایا، حضرت نے فرمایا: اب تم کیا چاہتے ہو؟ کہا موسیٰؑ نے توراۃ کی اور عیسیٰؑ نے انجیل کی مجھے تعلیم دی ہے اب میں چاہتا ہوں کہ آپ قرآن کی تعلیم فرمائیں! چنانچہ حضورﷺ نے قرآن کی ان کو تعلیم دی۔

تاثیر اسماء وغیرہ در جن:

آکام المرجان میں ابن عقیل کی ''کتاب الفنون'' سے نقل کیا ہے کہ: ہمارے بغداد کے محلّہ ظفریہ میں ایک گھر تھا جس میں کوئی رہ نہیں سکتا تھا، بہت سے لوگ رات کو رہے اور صبح کو مردہ پائے گئے، ایک شخص نے وہ مکان کرایہ پر لیا ہر چند لوگوں نے منع کیا مگر نہ مانا اور اس میں اتر پڑا، لوگ صبح ہوتے ہی اس کی حالت دریافت کرنے گئے تو وہ صحیح سالم تھا اور ایک مدت تک اس میں رہا، لوگوں نے کیفیت دریافت کی تو کہا کہ: میں نے جب عشاء کی نماز اس گھر میں پڑھی اور تھوڑا سا قرآن پڑھا تو ایک جوان کنویں میں سے نکلا اور مجھے سلام کیا میں سخت پریشان ہوا، اس نے کہا کہ ڈرومت میں چاہتا ہوں کہ تم سے قرآن پڑھوں! چنانچہ میں نے پڑھانا شروع کیا، ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ اس گھر کے واقعات جو لوگ بیان کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ کہا کہ ہم لوگ مسلمان جن ہیں نماز قرآن پڑھتے ہیں، اس گھر کو اکثر فساق کرایہ پر لے کر اس میں شراب خواری کیا کرتے تھے اس وجہ سے ہم ان کو مارڈالتے تھے، میں نے کہا کہ مجھے

رات کو آپ سے خوف ہوتا ہے بہتر ہوگا کہ دن کو تشریف لایا کریں کہا اچھا، اور ہر روز دن کو کنویں سے نکل کر میرے پاس آیا کرتا، ایک روز وہ پڑھ رہا تھا کہ راستہ میں کسی نے کہا کہ کیا کسی کو بدنظری اور جن کا علاج کرانا ہے؟ کہا اس کو بلالو، جب میں نے اس کو بلایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ غائب ہے اور ایک بڑا سانپ چھت پر جا رہا ہے اس عامل نے کچھ پڑھنا شروع کیا جس سے وہ سانپ لٹکنے لگا تھوڑی دیر میں وہ اس رومال میں گر پڑا جسے عامل نے پہلے سے بچھا رکھا تھا وہ اٹھا اور اسے زنبیل میں داخل کرنا چاہا تو میں نے منع کیا، اس نے کہا کیا مجھے اپنے شکار کو لے جانے سے روکتے ہو؟ میں نے ایک دینا ردے کر اسے رخصت کیا سانپ حرکت کرکے اپنی شکل سابقہ پر ہو گیا مگر اس کی حالت نہایت متغیر تھی میں نے کہا تمہاری کیا حالت ہے؟ کہا اس شخص نے چند اسماء پڑھ کر مجھے مار ڈالا! مجھے امید نہیں کہ میں جانبر ہوسکوں تم اس کنویں کی طرف کان لگائے رکھو، اگر اس میں سے چیخ کی آواز آئے تو یہاں سے فوراً بھاگ جانا! چنانچہ رات کو میں نے آواز سنی اور فوراً بھاگ گیا ابن عقیل نے لکھا ہے کہ اس کے بعد اس مکان میں پھر کوئی نہ رہا اس سے ظاہر ہے کہ اسماء ان میں ایسی تاثیر کرتے ہیں جیسے زہر انسان میں اور آکام المرجان میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ایماندار اپنے شیطان کو ایسا دبلا کرتا ہے جیسے کوئی سفر میں اونٹ کو۔

قیس بن حجاج کہتے ہیں کہ: میرے شیطان نے ایک روز مجھ سے کہا کہ جب میں تم میں داخل ہوا تھا تو اونٹ کے جیسا تھا اور آج میری یہ حالت ہے کہ چڑیا کے مثل

ہوگیا ہوں ! میں نے کہا یہ کیوں؟ کہا کہ تم قرآن پڑھ کر مجھے گلاتے رہتے ہو، یہ ان شیاطین کا حال ہے جو ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں جس کو ''قرین'' کہتے ہیں، متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ ہر انسان کا ایک قرین جن سے ہوتا ہے جو کافر ہوتا ہے، صحابہؓ نے پوچھا کیا وہ آپ کے ساتھ بھی ہے؟ فرمایا ہاں مگر میرا قرین مسلمان ہوگیا ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ آدمؑ پر مجھے دو باتوں میں فضیلت حاصل ہے، ایک یہ کہ میرا شیطان کافر تھا حق تعالی نے میری مدد کی یہاں تک کہ وہ مسلمان ہوگیا، اور میری بیویاں میری مدد کیا کرتی ہیں، بخلاف آدمؑ کے کہ ان کا شیطان کافر تھا اور ان کی بیوی نے خطا پر ان کی مدد کر کے انہیں ضرر پہونچایا، الحاصل جن خواہ قرین ہو یا نہ ہو اس کے جسم پر اسماء کی تاثیر ہوتی ہے بخلاف دوسرے انواع واجناس کے۔

آکام المرجان میں روایت ہے کہ زبیر ابن العوامؓ کہتے ہیں کہ ایک روز آنحضرت ﷺ مجھے اپنے ہمراہ لے کر جنگل کی طرف چلے جب بہت دور نکل گئے تو ایک میدان نظر آیا جس میں بہت اونچے اونچے لوگ تھے جن کا قد بھالے بھالے برابر تھا جب میں نے ان کو دیکھا تو مارے خوف کے لرزنے لگا یہاں تک کہ میرے پاؤں میرے جسم کو تھام نہیں سکتے تھے، حضرت ﷺ نے اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے ایک لکیر کھینچ کر مجھے فرمایا کہ اس کے اندر بیٹھ جاؤ! جب میں اس میں بیٹھ گیا تو وہ خوف میرے دل سے جاتا رہا پھر حضرت ﷺ ان کو تعلیم وتلقین فرما کر واپس تشریف

لائے ،اس قسم کے واقعات متعدد ہوئے ہیں سب میں یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ جن صحابیوں کو ہمراہ لے جاتے تھے ان کو لکیر کے حصار میں بٹھاتے تھے یہ لکیر دیکھنے کو لکیر تھی مگر دراصل ایک مضبوط قلعہ تھا کہ تمام روئے زمین کے جن اس کو توڑنا چاہتے تو نہ توڑ سکتے ! حالانکہ جنوں کی قوت مشہور ہے چنانچہ قرآن شریف میں ہے کہ سلیمانؑ سے ایک جن نے کہا کہ اگر آپ فرماتے ہیں تو تخت بلقیس کو میں آپ کا دربار برخواست ہونے سے پہلے اٹھا لاتا ہوں حالانکہ وہ تخت بہت ہی بڑا اور سینکڑوں میل دور تھا اتنی قوت پر بھی اس لکیری حصار کو جنات توڑ نہ سکے۔

آکام المرجان میں ہے کہ ابن مسعودؓ کو آنحضرت ﷺ ایک بار ساتھ لے گئے وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت ﷺ مجھے لکیر کے اندر بٹھا کر تشریف لے گئے تو میں نے دیکھا کہ دور سے ایک سیاہ غبار اٹھا جس سے مجھے خوف ہوا کہ قبیلہ ہوازن نے مکر کر کے قتل کے ارادہ سے حضرت ﷺ کو یہاں بلایا ہے اور اب وہ آن پہنچے !اس خیال کے تحت باہر نکلنا چاہا تھا کہ حضرت ﷺ کا ارشاد یاد آ گیا جو تاکید سے فرمایا تھا کہ اس مقام سے علحدہ نہ ہونا ! میں وہیں بیٹھا رہا جب حضرت ﷺ تشریف لائے اور میں نے اپنا قصہ بیان کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس لکیر سے نکلتے تو تمہیں کوئی جن اڑا لے جاتا اس سے ظاہر ہے کہ اس لکیری دائرہ کے اندر داخل ہونا ان کی قدرت سے باہر تھا اسی وجہ سے عامل لوگ کچھ پڑھ کر لکیری حصار کر دیتے ہیں خواہ بذریعۂ خط یا بذریعۂ اشارہ،اور ہر چند جن عاملوں کے دشمن ہوتے ہیں مگر جب تک عامل حصار میں ہوتا ہے وہ کچھ نہیں کر سکتے۔

شیخ اکبر قدس سرہ نے فتوحات کے باب مقام معرفت محبت میں لکھا ہے کہ
:اشبیلیہ میں ایک عارفہ تھیں جن کا نام فاطمہ بنت مثنی تھا،ان کی حالت بیان کر کے
لکھا ہے کہ ایک روز انہوں نے کہا کہ: میرے حبیب نے مجھے سورہ فاتحہ دی ہے جو میری
خدمت کرتی ہے اس نے مجھے خدا کی جانب سے دوسری طرف مشغول نہ کیا میں اس
تقریر سے ان کا مقام سمجھ گیا ایک روز ہم بیٹھے تھے کہ ایک عورت آئی اور مجھ سے کہا اے
بھائی میرا شوہر شریش شذونہ میں ہے میں نے سنا ہے کہ اس نے وہاں نکاح کرلیا ہے
اب کیا کرنا چاہیے؟ میں نے کہا کیا تم چاہتی ہو کہ وہ تم سے ملے؟ کہا ہاں! میں نے
حضرت فاطمہ بنت مثنی سے کہا کہ اے اماں یہ عورت جو کہہ رہی ہے کیا تم نے نہیں سنا؟ کہا
اے لڑکے تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اسی وقت اس کی حاجت
روائی ہو اور اسکا شوہر اس کے پاس آجائے! کہا بہت اچھا میں اس کی طرف فاتحۃ
الکتاب کو بھیج کر کہتی ہوں کہ اس کے شوہر کو ابھی لے آئے! اور سورہ فاتحہ پڑھنا شروع کیا
اور میں بھی ان کے ساتھ پڑھنے لگا،ان کے پڑھنے میں ایک صورت ہوائیہ متجسد ہوتی
تھی یہاں تک کہ جب وہ سورہ ختم ہوئی تو ایک صورت ہوائی مکمل ہوگئی انہوں نے اس
سے کہا کہ: اے فاتحۃ الکتاب شریش شذونہ کو جا کر اس کے شوہر کو لے آ! ہرگز اس کو نہ
چھوڑنا اس کے بعد صرف اتنا وقت گزرا کہ آدمی وہاں سے آجائے اس کا شوہر آکر اپنے
اہل سے ملا۔

غوث الثقلین کی سلطنت:

دائرۃ المعارف میں معلم بطرس بستانی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہا: میری ایک لڑکی گھر کے چھت پر چڑھی تھی وہاں سے وہ غائب ہوگئی آپ نے فرمایا کہ آج رات کو تم محلّہ کرخ کے ویرانہ میں جاؤاور پانچویں ٹیلہ کے پاس بیٹھواور زمین پر یہ کہتے ہوئے ایک دائرہ اپنے اطرف کھینچ لوکہ ''بسم اللہ علی نیت عبد القادر'' جب اندھیرا ہوجائے گا تو جن کی ٹکڑیاں مختلف صورتوں میں تم پر گزریں گی ان کی ہیبت ناک صورتوں کو دیکھ کر ڈرنا نہیں، صبح کے قریب انکا بادشاہ ایک بڑے لشکر میں آئے گا اور تم سے پوچھے گا کہ تمہاری کیا حاجت ہے؟ تو کہہ دینا کہ مجھے عبدالقادرؒ نے بھیجا ہے! اور اس وقت لڑکی کا واقعہ بھی بیان کردو، اس شخص نے اس مقام پر جاکر حکم کی تعمیل کی اور کل واقعات وقوع میں آئے، جب بادشاہ نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ مجھے شیخ عبدالقادرؒ نے بھیجا ہے، یہ سنتے ہی وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور زمین بوسی کرکے دائرہ کے باہر بیٹھ گیا اور اس کی حاجت دریافت کی؟ جب اس نے اپنی لڑکی کا واقعہ بیان کیا تو اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ جس نے یہ کام کیا ہے فوراً اسے پکڑ کے لاؤ! چنانچہ ایک سرکش جن لایا گیا جس کے ساتھ میری لڑکی بھی تھی، اس نے حکم دیا کہ اس سرکش کی گردن ماردی جائے، اور لڑکی

کومیرے حوالہ کر کے رخصت ہو گیا۔

اس سے جنوں کے علم کا بھی حال معلوم ہوتا ہے کہ دائرہ تو کرخ میں کھینچا گیا اور مسافت بعیدہ پر بادشاہ کو خبر ہوگئی، کیونکہ رات بھر چل کر قریب صبح اس دائرہ کے پاس پہونچا جو صرف حضرت شیخ کی نیت پر کھینچا گیا تھا، اور اس سے حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کے تصرف کا حال بھی معلوم ہو گیا کہ جنوں پر آپ کا کیا اثر تھا کہ صرف لکیر جو آپ کی نیت پر کھینچی گئی تھی وہاں بادشاہ بذات خود حاضر ہوا اور زمین بوسی کی، غرض کہ لکیر کی تاثیر خاص طور پر ہوتی ہے۔

اور اسی قسم کی تاثیرات اور بھی ہیں چنانچہ آکام المرجان فی احکام الجان میں لکھا ہے کہ جریر بن عبداللہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ: جب تستر فتح ہوا تو میں نے کسی موقع پر لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہا کسی ہربذ (خادم آتشکدہ مغان) نے سن کر کہا کہ جب سے میں نے یہ کلام آسمان پر سنا تھا اس کے بعد سے اب تک کسی سے نہیں سنا! میں نے کہا یہ کیا بات ہے؟ کہا میں اکثر کسری اور قیصر کے پاس بطور وفد جایا کرتا تھا ایک بار کسری کے پاس گیا تھا جب واپس گھر آیا تو اپنی بیوی کو دیکھا کہ جس طرح میرے آنے پر ہمیشہ وہ خوش ہوتی تھی جیسے کہ عورتوں کی عادت ہے کہ مرد کے سفر سے واپس ہونے پر خوش ہوا کرتی ہیں اس بار خوش نہیں ہوئی، میں نے سبب دریافت کیا؟ اس نے کہا تم تو سفر پر گئے ہی نہیں روز گھر میں آیا جایا کرتے تھے، اس کے بعد وہ شخص ظاہر ہوا اور کہا میں تیری صورت میں اس عورت کے پاس آیا کرتا تھا اگر چاہتا ہے تو

اب باری مقرر کردی جاجائے ایک روز تو اس کے پاس رہے اور ایک روز میں! میں نے قبول کیا، ایک روز وہ میرے پاس آیا اور کمال اخلاص سے کہا کہ ہم لوگ نوبت بنوبت آسمان کی طرف اس غرض سے جاتے ہیں کہ وہاں کی خبریں چرالائیں آج میری باری ہے اگر خواہش ہے تو میرے ساتھ چل! میں نے کہا اچھا، جب رات ہوئی تو وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ مجھ پر سوار ہوجا! میں اس کی پیٹھ پر سوار ہوا دیکھا کہ خنزیر کے سے اس کی گردن پر بال ہیں، اس نے کہا کہ خبردار اچھی طرح بیٹھنا! اقسام کے خوفناک امور نظر آئیں گے اگر مجھ سے جدا ہوگیا تو سمجھ لینا کہ ہلاکت ہے! یہ کہہ کر وہ اوپر کی جانب چلا یہاں تک کہ آسمان کے قریب پہونچا اور وہاں میں نے سنا کہ کوئی کہہ رہا ہے **لاحول ولاقوۃ الا باللہ ماشاء اللہ کان ومالم یشألم یکن** یہ سنتے ہی جتنے جن وہاں تک پہونچے تھے ان کی عجب حالت ہوئی کوئی کہیں گرا کوئی کہیں، غرض وہ کلمات میں نے یاد رکھ لئے جب صبح ہوئی میں اپنے گھر آیا اس کے بعد جب وہ آتا میں وہ کلمات کہتا اور وہ بے قرار ہوکر بھاگ جاتا، چنانچہ چندروز کے بعد اس نے آنا موقوف کردیا یہ تاثیر صرف الفاظ کی ہے۔

غرض کہ جس طرح ہمارے اجسام میں سموم وغیرہ کی تاثیر ہوتی ہیں جنوں کے اجسام میں لطیف چیزوں کی تاثیر ہوتی ہیں، حضرت غوث الثقلین کی سلطنت معنوی کا جو حال لکھا گیا ہے اسی مناسبت سے ایک واقعہ لکھا جاتا ہے جو خالی از دلچسپی نہیں وہ یہ ہے:

میرے ایک دوست ہیں جن کو میں چالیس سال سے جانتا ہوں کہ نہایت متقی

محتاط اور باخدا شخص ہیں جن کے تقدس پر صدہا شخص گواہی دیتے ہیں، اور ان کے فرزند جن کی نشو ونما صلاح وتقویٰ میں ہوئی ان دونوں سے خود میں نے سنا ہے اور میں یقیناً کہتا ہوں کہ ان کی صدق بیانی میں مجھے ذرا بھی شک نہیں ان کا نام کسی مصلحت سے میں ظاہر نہیں کرسکتا، ان دونوں صاحبوں کا بیان ہے کہ صاحب مرقوم الصدر نے اپنے چھوٹے لڑکے کی شادی کی اس کے ساتھ ہی دولھا بیمار ہوا چونکہ صاحب موصوف خود بھی عامل ہیں انہوں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جن مسلط ہوگیا ہے بہت کچھ تعویذ فلیتے کئے کچھ فائدہ نہ ہوا، آخر لوگوں کی نشاندہی پر حضرت میراں داتار قدس سرہ کی خدمت میں مع بیمار حاضر ہوئے جن کا مزار انادہ شریف اسٹیشن علاقہ اونجا صوبۂ گجرات میں واقع ہے، جب وقتِ مقررہ پر مزار شریف کے قریب بیمار بغرض علاج لایا گیا تو اس پر بیہوشی طاری ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ کہنے لگا کہ: تم نے مجھے بلا کر قید کردیا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس بیمار کے واسطے بلاتے ہو تو میں کبھی نہ آتا! بیمار کی حالت اور دیکھنے کی ہیئت گواہی دے رہی تھی کہ وہ صاحب قبر کو دیکھتا ہے اور خاص ان سے سوال وجواب کررہا ہے اثنائے گفتگو میں کچھ پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکتا جاتا تھا جیسے کوئی عامل مخاطب پر اثر ڈالنے کے لئے پھونکتا ہے، بیمار کی تقریر سے صاف معلوم ہورہا تھا کہ حضرت نے ہماری طرف سے اسے کچھ فرمایا جس کا وہ جواب دے رہا ہے اس نے کہا کہ میں جو مسلط ہوا ہوں اس میں میرا کوئی قصور نہیں میں نے ان سے کئی بار مختلف طریقوں سے کہہ دیا تھا کہ اس لڑکی سے نکاح مت کرو، مگر انہوں نے نہیں مانا آخر میں

نے اس کی اطلاع میر محمود صاحب کو دی جن کا مزار حیدرآباد کے مغرب میں ایک پہاڑی پر ہے جس خاندان کی یہ لڑکی ہے وہ لوگ میرا حق اداء کیا کرتے تھے یعنی نرسو کے نام پر کچھ نکالتے تھے، حضرت نے فرمایا یہ لوگ مسلمان ہیں ان سے کوئی توقع مت رکھ یہ تجھے کچھ نہ دیں گے کہا اگر نہ دیں تو لڑکی میرے حوالے کردیں، حضرت کی جانب سے کسی قسم کی تہدید ہوئی تو اس نے کہا تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جیسے تم ایک عہدہ دار ہو میں بھی عہدہ دار ہوں اور میرا ماموں محکمہ صفائی کا افسر اور صاحب فوج ولشکر ہے، چنانچہ اس کا ماموں آیا اور یہ بات قرار پائی کہ آج مقدمہ ملتوی کردیا جائے کل ایک کمیٹی ہو جس کے چھ اراکین ہوں جن میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ میر مجلس اور اراکین: حضرت بابا شرف الدین صاحب برہاوی، حضرت نصیر الدین چراغ دہلی، حضرت ابوسعید بغدادی ،حضرت بابا شرف الدین صاحب بھی شریک ہوں جن کا مزار حیدرآباد کے جنوب میں پہاڑی پر ہے، چنانچہ مجلس برخواست ہوئی اور بیمار کو ہوش

آگیا، دوسرے روز وقتِ مقررہ پر جب بیمار مزار شریف کے پاس لایا گیا تو تھوڑی دیر میں بے ہوش ہوگیا اور اراکین کی آمد شروع ہوئی، ہر ایک کو وہ مثل ہنود کے اس صفائی سے ڈنڈوت کررہا تھا جیسے مہذب ہنود کیا کرتے ہیں حالانکہ اس لڑکے نے عمر بھر ڈنڈوت نہیں کیا اس کے بعد گفتگو شروع ہوئی، اس لب ولہجہ سے وہ گفتگو کرنے لگا جیسے کوئی اعلیٰ درجہ کا بیرسٹر کرتا ہے اور عبارت ایسی شستہ تھی جیسے ناولوں کی ہوتی ہے جس کے سننے کو جی چاہتا تھا اثنائے گفتگو میں مڑکر حکم دیتا تھا کہ فلاں فوج کو آراستہ کرکے لاؤ، اور

فلاں فوج کو یہ حکم دو! منجملہ اور دلائل کے ایک دلیل اس نے یہ بھی پیش کی کہ میں نے ان کوکئی بار مختلف قرائن سے میر محمود صاحب کو باضابطہ اس کی اطلاع دے دی، اگر شبہ ہو تو اس کی مسل ان سے طلب کر لی جائے! چنانچہ ایک سوار مسل لانے کو روانہ ہوا اور بیمار خاموش ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد مِسل آئی اور پھر گفتگو شروع ہوئی اور ایسے دلائل اس نے قائم کئے کہ جن کا جواب نہیں ہو سکتا تھا، اس کے بعد ہر چند اہل کمیٹی نے اس پر زور دیا کہ آئندہ کوئی قسم کا تعارض بیمار سے نہ کرے! مگر اس نے نہیں مانا اور کہا کہ میں اس کمیٹی کے حکم سے راضی نہیں ہوں شہنشاہ کے پاس اس مقدمہ کی مسل روانہ کر دی جائے! چنانچہ بغداد شریف کو مِسل روانہ کر دی گئی اور مجلس برخاست ہوئی، تیسرے روز جب اجلاس ہوا تو حضرت غوث الثقلینؒ کا فرمان صادر ہوا جس میں یہ حکم تھا کہ: تو کیا سمجھتا ہے اگر میں چاہوں تو تجھے جلا کر خاکِ سیاہ کر دوں، مگر تو نے جب ان کو اطلاع کر دی تھی تو معاف کیا گیا، مگر ہمارے لوگوں کی شان میں تو نے جو بے ادبی کی ہے اس کی پاداش میں یہ سزا دی جاتی ہے کہ پابہ زنجیر کر کے اجمیر کے فلاں پہاڑ پر پانچ سال با مشقت محبوس رکھا جائے گا، اور روشن علی صاحب داروغۂ مجلس کو حکم دیا گیا کہ وہ دفعہ مشقت لی جائے، اور طرف ثانی پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا اس کے بعد بیڑیاں اور ہتھکڑیاں لائی گئیں اور بیمار کے دونوں ہاتھ مل گئے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں اور اس کے بعد بیڑیاں پہنا دی گئیں، اور ساتھ ہی بیمار کو ہوش آ گیا، اور اس وقت سے اب تک جس کو ایک سال سے زیادہ عرصہ گزرا بیمار پر کسی قسم کا اثر نہیں، دیکھئے

ہتھکڑیاں بیڑیاں پہننا ایک قسم کا مشاہدہ ہوگیا اور اس کے آثار بھی مرتب ہوئے کہ بیمار کو صحت ہوگئی، اب وہ بیڑیاں وغیرہ معلوم نہیں کہ لوہے کی تھیں یا اور کسی چیز کی؟ مگر اتنا تو ضرور ثابت ہوا کہ وہ ایسی مضبوط تھیں کہ جن ان کو نہ توڑ سکیں، ہر چند یہ واقعہ عقل کے معیار پر قابل تصدیق نہیں، مگر کئی صاحبوں نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ حضرت میراں داتار کی قبر پر ہمیشہ آسیب زدہ آتے ہیں اور صحت پا کر جاتے ہیں روزانہ اس قسم کے صدہا واقعات کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔

قطع نظر اس کے میں نے دیکھا ہے کہ آج کل دنیائے فلسفۂ جدیدہ میں ایک ہل چل مچی ہوئی ہے اور لاکھوں فلاسفر ایسے امور کے قائل ہوتے جاتے ہیں جس کو عقل ہرگز قبول نہیں کرتی، جیسے ہوشیار آدمی کے جسم میں سے کل اعضاء آدھے آدھے چرا لے جانا وغیرہ، چنانچہ فاضل فرید وجدی نے لکھا ہے کہ یورپ وامریکہ میں ماہانہ بیس (۲۰) رسالے ان مسائل سے متعلق نکلتے ہیں جو ایسے واقعات عجیبہ وغریبہ سے بھرے ہوتے ہیں اس لئے میں نے اس بیان پر جرأت کی ہے۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ حضرت غوث الثقلین کو اس وقت بھی وہی سلطنت حاصل ہے جو زندگی میں تھی، جنوں کو چونکہ بوجہ لطافت روحانیت سے مناسبت ہے اسلئے وہ اس عالم کے حالات کو مشاہدہ کرتے ہیں اور انسان نہیں کر سکتے، مگر حضرتِ انسان کو بھی ایک ایسی قوت دی گئی ہے کہ اگر اس میں کمال حاصل کریں تو علاوہ اس عالم کے مشاہدہ کے ایسے ایسے کرشمے بتائیں کہ ''جن'' بھی حیران ہوجائیں وہ قوت یہی

خیال ہے، جب وہ پختہ کیا جاتا ہے تو خیال منفصل کا جو عالم ہے اس میں تصرفات کرنے لگتا ہے چنانچہ اپنی صورت کو خیال منفصل میں قائم کر دیتا ہے، قضیب البانؒ وغیرہ کو یہی بات حاصل تھی، اس کا حال حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے فتوحات مکیہ میں خوب تفصیل سے لکھا ہے، اولیاء اللہ اس وجہ سے کہ خدائے تعالی کے وہ محبوب ہیں ان کو جو قدرت دی جاتی ہے اس کا تو یہ بیان نہیں ہوسکتا، مگر ظاہراً اس عالم میں ان کو تصرف اس غرض سے دیا جاتا ہے کہ ان کی کرامت ظاہر ہو۔

کرامات اولیاء اللہ:

بات یہ ہے کہ جب مسلمان شخص خدا اور رسول کی مرضی کے مطابق کام کرتا ہے تو وہ خدائے تعالی کے نزدیک مکرم یعنی صاحب کرامت ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقَاکُمْ یعنی: خدائے تعالی کے نزدیک تم میں کا وہی شخص زیادہ کرامت والا ہے جو زیادہ تر متقی ہو، جب تقوی کی وجہ سے کوئی شخص خدائے تعالی کے نزدیک باکرامت ہو جائے تو بحسب مقتضائے وقت وصلاحیت اس کو تصرف کی اجازت دی جاتی ہے جس سے لوگوں کو بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ صاحب کرامت ہے ،اس سے یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ کرامت اس فعل کا نام نہیں ہے جو ولی سے بطور خرق عادت صادر ہوتا ہے بلکہ وہ فعل اس امر پر قرینہ ہے کہ وہ شخص عنداللہ مکرو باکرامت

ہے جو فعل بالذات کرامت پر دال ہے وہ تقوی ہے، اگر خدائے تعالی نے کسی کو صفت تقوی عنایت کی ہے تو یقیناً سمجھا جائے گا کہ وہ عند اللہ مکرم یعنی با کرامت ہے اور دوسرے افعال و خوارق عادات بالواسطہ اور بالتبع کرامت سمجھے جائیں گے یعنی تقوی کی وجہ سے وہ تصرفات ہوں گے۔

شیخ الاسلام سبکیؒ نے طبقات شافعیہ میں لکھا ہے کہ ابوعلی رودباری کہتے ہیں کہ ابوالعباس رقی سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ: میں ایک بار ابوتراب نخشبیؒ کا ہم سفر تھا مکہ معظّمہ کے راستہ میں مجھ پر تشنگی غالب ہوئی، شیخ سے عرض کی انہوں نے زمین پر پاؤں مارا جس سے نہایت سرد و شیریں پانی کا چشمہ جاری ہوگیا، میں نے کہا میرا جی چاہتا ہے کہ ایسا لطیف پانی عمدہ پیالہ میں پیوں! آپ نے زمین پر ہاتھ مارا نہایت شفاف بلوریں پیالہ برآمد ہوا، چنانچہ مکہ معظّمہ تک وہ پیالہ ہمارے ساتھ رہا، ایک روز انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ: تمہارے اصحاب ایسے امور میں کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا میں نے تو کسی کو کرامتوں کا انکار کرتے نہیں دیکھا، فرمایا یہ سچ ہے کہ کرامت کا منکر کافر ہے مگر میں نے جو تم سے پوچھا مقصود اس سے یہ تھا کہ جس کا یہ حال ہو اس کی نسبت کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا: میرے خیال میں اس وقت ان کا کوئی قول نہیں فرمایا: تمہارے اصحاب کا یہ قول ہے کہ جس کو یہ تصرف دیا جاتا ہے وہ خدائے تعالی کی جانب سے اس کے حق میں خداع ہے مگر یہ قول عموماً درست نہیں، البتہ خداع اس کے حق میں ہے جس کا مقصود اصلی صرف خوارق عادات کا اظہار ہو اور جس کا یہ خیال نہ ہو تو وہ ربانیین میں

سے ہے، امام ابن تقی الدین سبکیؒ نے اس کے بعد مسئلہ کرامت میں نہایت مبسوط بحث کی ہے اس میں سے بحسب ضرورت یہاں لکھا جاتا ہے۔

بعض علماء نے کرامت کا بالکل ہی انکار کردیا، اور بعض کہتے ہیں کہ کرامت حد خرق عادت تک نہیں پہونچ سکتی ورنہ معجزہ کی مشابہ ہوجائے گی اور نبی اور ولی میں اشتباہ ہوجائے گا، قدریہ کرامت کا بالکلیہ انکار کرتے ہیں ان کے شبہات یہ ہیں کہ اگر کرامت جائز رکھی جائے تو سفسطہ کی نوبت پہونچ جائے گی اور یہ کہنا پڑے گا کہ ممکن ہے کہ پہاڑ سونا ہو اور سمندر خون ہوجائے، اور گھر کے برتن بڑے بڑے فاضل امام ہوجائیں، اور نیز وہ معجزہ کے مشابہ ہوگی جس سے معجزہ کی دلالت جو نبوت پر ہوتی ہے فوت ہوجائے گی، اور نیز اگر ولی سے خوارق عادات صادر ہوتی ہیں اور کوئی نبی اس وقت مبعوث ہو تو چونکہ ولی کے حق میں خوارق عادات عادی امور ہوگئے ہیں اس لئے اس کے نزدیک نبی کی نبوت کو تصدیق کرنے کے لئے کوئی دلیل نہ ہوگی، اور ایک شبہ یہ بھی ہے کہ جب کسی شخص صالح کے لئے کرامت جائز ہو تو ممکن ہے کہ صالح بہت سے ہوں اور جب یہ سب خوارق عادات ظاہر کریں تو وہ عادت ہوگئی، اس کے بعد خوارق عادات نبوت پر دلیل نہیں ہوسکتیں اور ان کا یہ بھی استدلال ہے کہ اگر کرامت کسی کو دی جائے تو صحابہؓ زیادہ تر اس کے مستحق تھے حالانکہ ان کے ہاتھ پر کبھی کرامت ظاہر نہ ہوئی۔

یہ قدریہ کے شبہات ہیں اس کے جوابات امام موصوف نے نہایت تفصیل سے دئے ہیں جن کا ذکر موجب تطویل ہے، اگر غور کیا جائے تو ان شبہات میں اکثر کا

مدار امکان پر ہے مگر یہ دیکھا جائے کہ ایسا امکان بھی مضر ہوسکتا ہے یا نہیں؟ ہر ایماندار اس کی تصدیق کرتا ہے کہ خدائے تعالی نے ازل ہی میں فیصلہ فرمادیا کہ عالم میں کس قسم کی کتنی چیزیں پیدا کی جائیں گی اور ان کے تفصیلی حالات کیا ہوں گے؟ اور ہر ہر آن میں جو عوارض ہر چیز پر آنے والے ہیں سب متعین ہوگئے، جس زمانے میں جس چیز پر جو حالت ہوتی ہے وہ ازل میں حق تعالی کے پیش نظر ہوچکی اور ابد تک علم ایک حالت پر ہے، ارشاد ہے مَا یُبَدِّلُ الْقَوْلَ لَدَیَّ مثلاً اگر زید کو ازل میں عالم کیا ہے تو کوئی اس کو جاہل بنا نہیں سکتا، اور اگر جاہل کیا ہے تو کوئی اس کو عالم بنا نہیں سکتا، تقدیر کے مسئلہ کو تو ہم نے بفضلہ تعالی مقاصد الاسلام کے حصہ سوم میں حکمت جدیدہ کے طریقہ سے بھی ثابت کیا ہے۔

غرضکہ جب ازل سے ابد تک موجود ہونے والی ہر چیز خدائے تعالی کے علم میں اس طور پر ممتاز و مشخص ہے کہ ہر آن میں وہ کن اوصاف سے متصف ہوگی تو یہ احتمال ہی نہ رہا کہ ان معلومات الٰہیہ کے سوا کوئی چیز وجود میں آئے گی یا ان میں کسی قسم کا تغیر وتبدل ہوگا، اس صورت میں جو چیز وجود میں آتی ہے وہ ضرور ''واجب الوجود'' ہوگی لیکن وجوب ذاتی نہ ہوگا بلکہ لغیرہ ہوگا، اب اگر اس کو ممکن کہیں تو صرف اس کے مراتبہ ذات کا امکان مراد ہوگا پھر قبیل وجود بھی اگر دیکھا جائے تو چونکہ علم الٰہی میں اس کے تمام حالات وکیفیات معین ہوچکے ہیں کہ فلاں چیز جب وجود میں آئے گی تو وہ اس طور پر ہوگی تو وہاں بھی ایک جانب کی ترجیح ہوگی اور ممکن کی جو دو جانب ہوتی ہیں اس میں دوسری

جانب مرجوح ہوگئی جس کی ترجیح محال ہے تو اس صورت میں جانب مرجوح کا محال ہونا ثابت ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ عالم میں دو ہی چیزیں ہیں: واجب یا ممتنع، ممکن کوئی چیز نہیں۔

اب جو کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے کہ کرامت سے ظروف فاضل بن جائیں اور یہ ہو اور وہ ہو، تو یہ صرف احتمال ہی احتمال ہے ممکن کوئی چیز نہیں خدائے تعالی نے جس ولی کے ہاتھ سے جو کام ہونا ازل میں معین فرمادیا ہے اس کا وجود واجب ہے، اور جو اس کے خلاف ہے اس کا وجود ممتنع، ولی کا ارادہ ایسی چیز سے متعلق ہو ہی نہیں سکتا جو خلاف مشیت الٰہی ہو۔

حدیث صحیح میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ان قلوبنا ونواصینا وجوارحنا بیدک لم تملکنا منها شیئا یعنی یا اللہ ہمارے دل اور پیشانی کے بال اور کل جوارح تیرے ہاتھ میں ہیں تو نے ان میں سے کسی چیز کا ہمیں مالک نہیں بنایا، اس صورت میں امکانی احتمالات سب باطل ہوگئے، اور اگر پہاڑ کا سونا کسی کی کرامت سے ہونا علم الٰہی میں ہے تو وہ ضرور ہوگا، کیا کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ خدائے تعالی پہاڑ کو سونا نہیں بنا سکتا؟ ہرگز نہیں! پھر کرامت سے پہاڑ سونا بن جائے تو کیا تعجب ہے؟ اگر اسی کا نام سفسطہ ہے تو روزانہ لاکھوں سفسطے وجود میں آتے ہیں، دیکھئے نباتات کا انسان اور امام و فاضل بننا روزانہ برابر دیکھا جاتا ہے جس کا حال ہم نے کتاب العقل میں تفصیل سے لکھا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ نبی اور ولی میں فرق نہ رہے گا تو اس کا منشاء یہ ہے کہ معترض نے ولی کو فاسق سمجھا ہے کہ وہ کرامتیں دکھلا دکھلا کر لوگوں کو نبی کی طرف سے اشتباہ میں ڈال دے گا تا کہ نبی کی نبوت ثابت نہ ہونے پائے !! اگر ایسا ولی فرض کیا جائے تو وہ واقع میں ولی نہیں ہوسکتا، اس کے حسب حال یہ شعر ہے؟

کار شیطاں می کند نامش ولی

گر ولی اینست لعنت بر ولی

اور اگر ولی ایسا شخص ہے جو سر مو خدائے تعالی کی مرضی کے خلاف نہ کرے تو وہ اگر نبی کے ساتھ رہ کر بھی کرامتیں ظاہر کرے تو اس سے نبی کی نبوت کی تائید ہوگی کیونکہ وہ لوگوں سے صاف کہا کریگا کہ میں ان کا ایک ادنی غلام ہوں اور ان ہی کی اتباع کی بدولت مجھے یہ مرتبہ حاصل ہوا، اس سے تو بجائے اس کے کہ نبوت میں اشتباہ واقع ہو لوگوں کو ایمان لانے کی ترغیب ہوگی۔

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ معجزہ اور کرامت میں فرق نہ ہوگا یہ درست ہے، کیونکہ خرق عادت خواہ نبی سے صادر ہو یا ولی سے بغیر اجازت الٰہی ممکن نہیں، مگر جس کے ہاتھ پر خرق عادت ظاہر ہوئی وہ نبی تھے تو کہہ دیتے تھے کہ ہم نبی ہیں اور اس پر ہمیں یہ نشانی دی گئی ہے اگر تمہیں شک ہو تو مقابل ہو کر یہی کام کر دکھاؤ، اس دعوے اور دلیل کے بعد اہل انصاف ان کی نبوت کو تسلیم کرتے گئے اور اگر وہ یعنی صاحب خرق عادت ولی ہوں تو کبھی اس قسم کا دعوی نہیں کر سکتے، اگر بفرض محال نبوت کا دعوی کیا تو ولایت تو درکنار

مسلمانوں میں بھی ان کا ٹھکانا نہیں کیونکہ نبوت کا جھوٹا دعوی کرنے والا یقیناً کافر ہے اور کافروں میں بھی اعلی درجہ کا ،اسی کو دیکھ لیجئے کہ اگر بادشاہ کسی کو اپنی طرف سے کسی ملک کا حاکم بنادے اوراس کے ساتھ ایسی نشانی مثل پروانہ دے کہ کوئی دوسرا وہ نشانی نہیں لاسکتا تو وہ حاکم بادشاہ کا موردعنایت سمجھا جائے گا بخلاف اس کے اگر ایک شخص اسی قسم کی نشانی کسی ملک میں لے جا کر یہ دعوی کرے کہ بادشاہ نے مجھے حاکم بنادیا ہے اور ایک جعلی نشانی بھی پیش کردے تو کیا ایسا شخص موردعنایت شاہی ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں ! بلکہ اس جرم کی پاداش میں ایسی سخت سزا تجویز کی جائے گی جو معمولی جرائم کی سز اسے بدر جہا زائد ہو۔

اب غور کیجئے کہ نبوت سے بڑھ کر خدائے تعالی کے یہاں کوئی مرتبہ اورعہدہ نہیں اگرکوئی شخص اپنی نام آوری یا متاع دنیوی حاصل کرنے کی غرض سے دعوائے نبوت کرے اوراس پر جعلی نشانیاں بھی پیش کرے تو کیا ایسا شخص خدائے تعالی کے نزدیک معمولی کافروں میں ہوگا ؟ میری دانست میں تو وہ فرعون وشداد سے بھی بدتر ہوگا، کیونکہ ان کو خدائے تعالی نے بادشاہت دی تھی اس لئے انہوں نے اپنی وجاہت ظاہری قائم رکھنے کی غرض سے نبیوں کا مقابلہ کیا ،بخلاف مدعیان نبوت کے کہ وجاہت پیدا کرنے اور دنیا حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے جھوٹ کہی اور جھوٹ بھی کیسی کہ خدائے تعالی پرتہمت لگائی کہ اس نے ہمیں بھیجا ہے،اوراس جھوٹ کو باوقعت بنانے کی غرض سے جعلی نشانیاں بنائیں لوگوں کوفریب دے کر ان کا مال کھایا، پہلے سے جس نبی کی

سلطنت قائم تھی بغاوت کر کے اس کو درہم و برہم کر دیا، نبی علیہ السلام اور اولیاء اللہ کو ایذائیں پہونچائیں، حق تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا یعنی جو لوگ خدا اور رسول کو ایذا دیتے ہیں ان پر دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور ان کے لئے خدائے تعالیٰ نے عذاب مہیا کر رکھا ہے اس کے علاوہ مدعیان نبوت کو کیسی کیسی جعل سازیاں اور اقسام کے جرائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے!!

ہم نے ''مفاتیح الاعلام'' میں مرزا صاحب قادیانی کے تھوڑے سے حالات لکھے ہیں اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ مدعیان نبوت کو کیسی کیسی مصیبتوں میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہوتی ہے اور کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

اور یہ جو کہا گیا کہ اولیاء سے خوارق صادر ہوں تو وہ بوجہ عادت معجزہ کو معجزہ نہ سمجھیں گے اس موقعہ پر بھی ''ولی'' ایک معمولی شخص خیال کر لیا گیا کہ وہ کرامتوں میں ایسا مشغول ہو جاتا ہے کہ نہ اسے خدا سے کام نہ رسول سے! کیا ایسا شخص ممکن ہے کہ ولی ہوسکے اور اس کی کرامتیں بحال رہیں؟ ہرگز نہیں! ولی تو وہ شخص ہوتا ہے کہ ہر آن میں اس کی توجہ خدائے تعالیٰ کی کی طرف رہتی ہے بذریعہ الہام یا کشف یا رؤیائے صالحہ سے انہیں اطلاع ہو جاتی تھی کہ ''فلاں نبی ہیں ان کی اتباع کرو''۔

پھر خوارق عادات کا امور عادیہ ہو جانا جو خیال کیا گیا ہے وہ بھی بے اصل محض ہے کیونکہ اس کا کوئی قائل نہیں کہ جو کام اولیاء اللہ کرتے ہیں سب خوارق عادات ہوتے

ہیں اس لئے خوارق کی ان کو عادت ہوجاتی ہے، غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ معاملہ بالعکس ہے اس لئے کہ ہر کام میں اولیاء اللہ کی نظر اس پر رہتی ہے کہ معمولی کام جن کو ہر شخص اپنے اختیاری سمجھتا ہے وہ بھی ہم سے وجود میں آتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ ان کو نبی ﷺ کے ارشاد پر تو پورا ایمان ہے کہ **اللھم ان قلوبنا ونواصینا وجوارحنا بیدک لم تملکنا منھا شیئاً** اگر کوئی اچھا کام ان سے صادر ہو گیا تو خدائے تعالی کا شکر بجالاتے ہیں کہ الٰہی اس کام کو صرف اپنے فضل وکرم سے تو نے انجام دیا ورنہ ممکن نہ تھا کہ ہم اپنی ذاتی قوت سے اس کو پورا کر سکتے جیسا کہ صاف ارشاد ہے **لاحول ولا قوۃ الا باللہ** اب کہئے جو لوگ معمولی کام کو بمنزلہ خرق عادت سمجھتے ہوں تو خرق عادت کی ان کے نزدیک کیسی وقعت ہوگی غرض کہ یہ ممکن نہیں کہ نبی کا معجزہ ان کی نظروں میں وقعت ہو سکے اس تقریر کے بعد اہل انصاف غور فرما سکتے ہیں کہ جو دلائل عدم جواز خرق عادت پر قائم کئے گئے ہیں وہ کس درجہ کی ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ صحابہؓ سے کرامت کا صدور نہ ہوا سو وہ غلط ہے، علامہ سبکیؒ نے صحابہؓ کی کرامات کی ایک فہرست ہی لکھی ہے جس کو ہم بالاختصار نقل کرتے ہیں:

صدیق اکبرؓ نے عائشہؓ سے فرمایا کہ: بیس وسق کھجور اس سال کے بارسے لے لینا! چند روز کے بعد فرمایا: اگر کھجوریں لے لی ہوں تو خیر ورنہ اب اس مال سے وارثوں کا تعلق ہو گیا اور صرف تمہارے دو بھائی ہیں اور دو بہنیں، انہوں نے کہا کہ میری بہن تو اسماء ایک ہی ہے! فرمایا دوسری حمل میں ہیں چنانچہ وہ تولد ہوئیں، دیکھئے حق تعالی

فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ عِندَہٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَافِی الْاَرْحَامِ آیت شریف میں پانچ چیزوں کا ذکر ہے جن کو خدائے تعالی ہی جانتا ہے منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ حمل لڑکے کا ہے یا لڑکی کا؟ صدیق اکبرؓ نے بلاتکلف خبر دے دی کہ حمل میں لڑکی ہے اور وہ خبر صحیح ہی نکلی، یہی کرامت ہے کہ خدائے تعالی نے ان کو وہ علم دیا جو خوداس کے ساتھ مختص تھا اور ابوبکرؓ نے اپنی موت کی خبر دے دی کہ بہت قریب ہے یہاں تک کہ ورثہ کا حق مال سے متعلق کر دیا!! ایسے موقعہ پر بعض لوگ ڈھٹائی سے کہہ دیتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات نص قرآن کے خلاف ہیں اس لئے ایسی روایات کو موضوع سمجھنا چاہئے ایسی جرأت کا منشا عدم غور و تدبر اور لاعلمی ہوا کرتا ہے ان سے پوچھا جائے کہ خدائے تعالی نے یہ کب فرمایا کہ ان چیزوں کا علم میں کسی کو دیتا ہی نہیں ہوں! بے شک وہ جانتا ہے اور اگر حق تعالی اپنی مخلوق میں سے کسی کو یہ علم عطا فرمادے تو علم الٰہی میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا، کیونکہ دوسروں کا جاننا علم الٰہی کے منافی نہیں پھر اگر کسی کو علم ہوتا بھی ہے تو وہ صرف عطائے الٰہی ہے جس میں اہلیت اور لیاقت دیکھتا ہے اسے عطاء فرماتا ہے ارشاد ہے وَمَا کَانَ عَطَاءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًا غرضکہ ایسی روایتوں کو موضوع قرار دینا کوئی علمی بات نہیں۔

ایک روز آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس کے یہاں دو شخصوں کا کھانا ہو تو اہل صفہ میں سے ایک شخص کو، اور جس کے یہاں چار شخصوں کا کھانا ہو تو پانچویں کو ساتھ لیجا کر کھانا کھلائیں! ابوبکرؓ تین شخصوں کو ساتھ لے گئے جب وہ ایک ایک لقمہ اٹھاتے تو

اتنا ہی کھانا نیچے سے بڑھتا جارہا تھا یہاں تک کہ جب فارغ ہوئے تو کھانا جتنا رکھا گیا تھا اس سے سہ چند زیادہ ہوگیا چنانچہ سب گھر والوں نے سیر ہوکر کھایا اور حصے بانٹے۔

عمرؓ نے ملک فارس پر کچھ لشکر ساریہ بن زنیم کے ہمراہ بھیجا جب وہ شہر نہاوند کے دروازہ پر پہونچے اور اس کا محاصرہ کرنا چاہا کفار کا لشکر کثیر آ گیا اور سخت لڑائی ہوئی ،اس وقت عمرؓ مدینہ منورہ میں جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے عین خطبہ میں باآواز بلند کہا یا ساریة الجبل ! یاسارية الجبل !من استرعی الذئب الغنم فقد ظلم یعنی اے ساریہ پہاڑ! اے ساریہ پہاڑ! جو شخص بھیڑئے سے بکریاں چرانے کا کام لے اس نے ظلم کیا،اس کلام کو کل لشکر اسلام نے سنا اور کہنے لگے یہ تو امیر المؤمنین کی آواز ہے! غرضکہ فوراً پہاڑ کی پناہ میں چلے گئے اور اس کے بعد ان کی فتح ہوگئی،علی کرم اللہ وجہہ بھی عمرؓ کا خطبہ سن رہے تھے،لوگوں نے کہا کہ امیر المؤمنین نے کیسی بات کہی! ہم کہاں اور ساریہ کہاں؟ علیؓ نے فرمایا: عمرؓ کے معاملہ میں دخل نہ دو،وہ جس کام میں داخل ہوتے ہیں اس کو پورا کرتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب لشکر کے لوگ واپس آئے تو وہ واقعہ بیان کیا کہ ہم لوگ امیر المؤمنین کی آواز سنتے ہی فوراً پہاڑ کی پناہ میں آ گئے،اس سے ثابت ہوا کہ عمرؓ کا وہ کلام بیکار نہ تھا بلکہ اس کی وجہ سے لشکر اسلام صرف تلف ہونے ہی سے نہیں بچا بلکہ اس کو فتح بھی نصیب ہوئی، دیکھئے اس وقت نہاوند اور اس کے مضافات عمرؓ کے پیش نظر تھے اور کوئی حالت وہاں کی مخفی نہ تھی جس طرح افسر اعلیٰ مواقع جنگ کو دیکھ سمجھ کر فوج کو لڑاتے ہیں عمرؓ نے بھی یہی کام کیا اور نادر بات یہ کہ ہزار ہا کوس پر آواز

فوراً پہونچ گئی۔

اگر صحابہؓ نفس کرامت کے قائل نہ ہوتے تو ضرور کہتے کہ آواز تو عمرؓ کی ہے مگر یہ تو ممکن نہیں کہ ان کو یہاں کے حالات پر اطلاع ہو کیونکہ علم غیب خدائے تعالیٰ کا خاصہ ہے اوراس کے خلاف خیال کرنا شرک فی العلم ہے، پھراپنی آواز کو ہزار ہا کوس سے یہاں پہونچانا شرک فی التصرف ہے، اگر عمرؓ کا یہ کام سمجھا جائے تو ایمان جانے کی بات ہے اس لئے اس میں شک نہیں کہ شیطان نے ہمیں تباہ کرنے کی خاطر یہ جعل سازی کی ہے اس وقت ہمیں چاہئے کہ شیطان کے مکروفریب سے بچنے کے لئے پہاڑ سے بہت دور ہٹ جائیں، اگراس قسم کے ''موحدانہ خیال'' ان کو آجائے تو سب غارت ہو گئے تھے۔

زمانۂ جاہلیت میں جب نیل کے جاری ہونے کا وقت آتا تو باکرہ لڑکی کو لباس فاخرہ اور زیور سے آراستہ وپیراستہ کرکے نیل میں ڈال دیتے جب عمرؓ کے وقت میں مصر فتح ہوا تو لوگوں نے عمرو بن عاصؓ سے جو وہاں کے حاکم تھے حسب عادت لڑکی کو نیل میں ڈالنے کی درخواست کی تو انہوں نے کہا کہ اسلام ایسے عادتوں کو ہدم کردیتا ہے، تین مہینے تک نیل جاری نہ ہوا یہاں تک کہ لوگوں نے قحط کی وجہ سے جلا وطن ہونے کا قصد کرلیا، عمرو بن عاصؓ نے عمرؓ کو اس واقعہ کی اطلاع کی! آپ نے لکھا کہ: تم نے بہت اچھا کیا کہ اجازت نہ دی! اسلام پہلی باتوں کو ہدم کردیتا ہے پھر امیرالمؤمنین عمرؓ نے ایک چٹھی نیل کے نام لکھی جس کا مطلب یہ تھا کہ: اے نیل اگر تو اپنی طرف سے جاری ہوا کرتا ہے تو مت جاری ہو، اوراگر اللہ القہار تجھے جاری کرتا ہے تو ہم اس سے

درخواست کرتے ہیں کہ تجھے جاری کردے اورفرمایا کہ یہ چٹھی نیل میں ڈال دو! چنانچہ ڈال دی گئی لوگوں نے جب صبح کو دیکھا تو سولہ (۱۶) ہاتھ بلند پانی اس میں جاری تھا۔

ایک شخص امیرالمؤمنین عثمانؓ کے پاس آرہا تھا راستہ میں ایک عورت پر اس کی نظر پڑی خوب غور سے اس کو دیکھا جب حاضر خدمت ہوا تو آپؓ نے فرمایا بعض لوگ ایسے بھی یہاں آتے ہیں جن کی آنکھوں میں زنا کا اثر رہتا ہے! اس شخص نے کہا: کیا رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی وحی اترا کرتی ہے؟ فرمایا نہیں! فراست سے ایسی باتیں معلوم ہوا کرتی ہیں یہ آپ کا ارشاد اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور الله یعنی ایماندار اللہ کے نور سے دیکھتا ہے جب مؤمن کامل اللہ تعالی کے نور سے دیکھتا ہو تو اس سے کونسی چیز چھپ سکتی ہے؟ ہمارے نور نظر کا جب یہ حال ہے کہ آسمان تک پہونچتا ہے تو خدائے تعالی کے نور کا کیا حال ہو؟ اب غور کیجئے کہ جس کی رؤیت کا ایسا ذریعہ ہو تو کیا بُعد و کثافت ایسے شخص کی رؤیت کے مانع ہوسکتی ہے۔

ایک رات علی کرم اللہ وجہہ اور دونوں صاحب زادے اپنے مکان میں تشریف رکھتے تھے کہ دو پہر رات کے بعد یہ اشعار آپ کو سنائی دیئے:

یامن یحبیب دعاء المضطر فی الظلم

یا کاشف الضر والبلویٰ مع السقم

قد نام و فدک حول البیت وانتبھوا

و عین جودک یا قیوم لم تنم

ھل لی بجودک فضل العفو عن زللی

یامن الیه رجاء الخلق فی الحرم

ان کان عفوک لایرجوہ ذوخطاء

فمن یجو د علی العاصین بالنعم

اپنے صاحبزادے سے فرمایا: دیکھو یہ کون پڑھ رہا ہے اور اس کو بلا لاؤ! وہ تشریف لے گئے اور اس سے فرمایا کہ امیرالمؤمنین تمہیں بلاتے ہیں! وہ شخص اٹھا اور اپنی ایک جانب کو گھسیٹتا ہوا آیا آپ نے فرمایا میں نے اشعار سنے بیان کرو کہ واقعہ کیا ہے؟ کہا کہ میری حالت یہ تھی کہ ہمیشہ لہولعب اور معصیت میں مشغول رہتا تھا اور میرے والد مجھے وعظ ونصیحت کرتے تھے کہ دیکھو خدائے تعالیٰ کی بڑی سطوت ہے اور وہ انتقام لینے والا ہے وہ ظالموں سے دور نہیں! جب وہ حد سے زیادہ نصیحت کرنے لگے تو مجھے غصہ آ گیا اور میں نے انہیں مارا پیٹا انہوں نے ساتھ ہی قسم کھالی کہ: میں مکہ معظّمہ کو جاکر بارگاہ کبریائی میں اس باب میں فریاد کروں گا چنانچہ وہ وہاں گئے اور دعاء شروع کی ،ہنوز وہ دعاء پوری نہیں ہوئی تھی کہ میرا ایک باز وسوکھ گیا جب مجھے یہ معلوم ہوا تو سخت ندامت ہوئی اور میں نے ان کی خوشامد کرکے انہیں راضی کرلیا، چنانچہ انہوں نے وعدہ کیا کہ: اب میں تیری صحت کے لئے اسی مقام میں دعاء کروں گا جہاں بددعاء کی تھی چنانچہ میں نے ان کے لئے اونٹنی کا انتظام کردیا اور وہ سوار ہوئے قسمت سے وہ اونٹنی ان کو لے کر بھاگی اور وہ اس پر سے گرکر مرگئے ،علیؓ نے پوچھا کہ: کیا فی الحقیقت وہ تجھ

سے راضی ہو گئے تھے؟ کہا خدا کی قسم وہ راضی ہو گئے تھے! آپ یہ سن کر اٹھے اور چند رکعت نماز پڑھ کر آہستہ آہستہ بارگاہ کبریائی میں کچھ عرض کیا اس کے بعد فرمایا: اے مبارک اٹھ! چنانچہ وہ شخص اٹھ کر چلنے لگا اور وہ شکایت بالکل رفع ہوگئی پھر فرمایا: اگر تم اپنے باپ کے راضی ہونے پر قسم نہ کھاتے تو میں دعاء نہ کرتا۔

اس واقعہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دو کرامتیں ثابت ہوئیں، ایک یہ کہ حق تعالی کے نزدیک آپ ایسے مکرم تھے کہ عرض کرنے کی دیر تھی کہ اس کی پذیرائی ہوگئی اور وہ اعضاء جو کہ مردہ ہو چکے تھے ان میں جان آگئی۔

دوسری کرامت یہ ہے کہ باوجودیکہ آپ کو عرب وعجم کی سلطنت حاصل تھی مگر حالت یہ کہ ایوان شاہی میں ایک بھی خدمت گار نہ تھا، چنانچہ دوپہر رات کے بعد جب آپ کو اس شخص کے بلانے کی ضرورت ہوئی تو اپنے صاحبزادے کو بھیجنا پڑا اس ترک وتجرید سے بڑھ کر اور کیا کرامت ہو سکتی ہے، ادنی ادنی حکام کے دروازوں پر خدم وحشم ہوتے ہیں اور خلیفہ رسول اللہ کی یہ حالت کہ نوکر تو درکنار وقت پر کھانا پیٹ کر بھر کر ملنا دشوار تھا جس کا حال ہم نے مقاصد الاسلام کے حصہ ششم میں لکھا ہے۔

ظاہر بین لوگ اس حالت کو کرامت نہیں سمجھ سکتے کیونکہ ان کے خیال میں تو جو کچھ وقعت ہے دنیا ہی کی ہے وہ فقر اختیاری کے مدارج کو کیا جانیں؟ دولت فقر اختیاری ہر کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی یہ تو انہیں حضرات کے حصہ میں آتی ہے جو خدائے تعالی کے نزدیک مکرم ہیں، قال اللہ تعالی اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ، اگر کرامت کے

معنی خرق عادت کے لئے جائیں تو وہ بھی فقر اختیاری میں صادق آتے ہیں دیکھئے صرف اس خیال سے کہ ہر حالت میں خدائے تعالی اضطراری طور پر یاد آتے رہے، تمام اسباب راحت ومعیشت کو ترک کر دینا کیا ہر کسی کا کام ہے! شاید لاکھوں میں کوئی ایک ہو جو خالصاً للہ ایسا فقر اختیار کرے۔

عموماً دیکھا جاتا ہے کہ اسباب معیشت فراہم کرنے کی فکر میں لوگ لگے رہتے ہیں اور اگر کوئی فقیر ہو بھی گیا تو اس میں بھی یہی مقصود ہوتا ہے کہ بذریعہ فقر دنیا حاصل ہو اور اگر اس سے مال مقصود نہ بھی ہو تو جاہ مقصود ہوتی ہے چنانچہ جب کوئی معتقد بغرض استفادہ حاضر ہو تو دنیا سے اپنی بے تعلقی بیان ہوگی اور چند حکایات نقل محفل ہوں گے کہ فلاں بادشاہ یا امیر یا تاجر وغیرہ نے ہمیں یہ دینا چاہا مگر ہم نے نہ لیا ہمیں دنیاداروں کی کچھ پرواہ نہیں ہم کو تو خاص خدائے تعالی سے تعلق ہے ہمارے نزدیک بادشاہ اور غریب دونوں یکساں ہیں پھر مریدوں میں ان حکایات کے چرچے ہوتے ہیں جس سے عام شہرت ہوتی ہے اور نذرونیاز کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔

اب فقر اختیاری کا حال بھی تھوڑا سا سن لیجئے: فتوحات مکیہ کے ایک سو اٹھاونویں (۱۵۸) باب میں لکھا ہے کہ اولیاء اللہ لذت کی چیزوں کو جن میں چکنائی اور رطوبت ہوتی ہے چھوڑ دیتے ہیں، اس وجہ سے کہ ان کے حبیب یعنی خدائے تعالی نے انہیں اس امر کی تکلیف دی ہے کہ راتوں کو اس کے روبرو کھڑے رہیں اور مناجات کریں ایسے وقت میں کہ لوگ نیند کی راحت میں ہوں انہوں نے دیکھا کہ جب

رطوبات جسم میں ہوتی ہیں تو ان کے بخارات دماغ کی طرف چڑھتے ہیں جن سے حواس میں تخذر اور سستی پیدا ہوکر نیند غالب ہوجاتی ہے جو مانع قیام لیل اور مناجات ہے پھران بخارات سے جسم میں قوت پیدا ہوتی ہے اور وہ قوت اعضاء کو فضول کاموں میں لگاتی ہے جن سے ان کے محبوب نے انہیں روکا ہے اس لئے وہ کھانا پانی چھوڑ دیتے ہیں اور اگر کھاتے ہیں تو اس اندازے سے کہ صرف ہلاکت سے بچ سکیں، اس وجہ سے رطوبت ان کے بدن میں کم ہوتی جاتی ہے اور نیند جاتی رہتی ہے اور بیداری قوت پاتی ہے جس سے ان کا مقصود جو قیام لیل ہے حاصل ہوتا ہے اور ان کے اوصاف میں لکھا ہے کہ ان کی وحشت کا مونس اور ان کی بیماریوں کا طبیب خدائے تعالی ہی ہوتا ہے ان کے ابدان متواضع اور ان کے ہاتھ اسی کی طرف دراز، ان کے دل اسی کی طرف مائل ومشتاق رہتے ہیں اگر انسیت ہے تو اسی سے اور اگر خوف ہے تو اسی کا، راحت ان سے مایوس ہے اور غفلت ان سے دور ہمیشہ وہ تضرع میں رہتے ہیں، اور اپنی خطاؤں سے معافی مانگا کرتے ہیں، اب کہئے کہ جن کی یہ حالت ہو ان کو تعلّی اور خودستائی سے کیا تعلق !! یہ بات ممکن ہے کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ کے لحاظ سے اظہار تشکر کرتے ہوں، اگر فی الواقع یہی ہو تو اس میں کسی کو کلام نہیں یہ معاملہ ان کے اور ان کے رب کے درمیان ہے۔

مگر قابل غور یہ امر ہے کہ جس وقت کوئی ایسا شخص جس کی وقعت لوگوں کے درمیان ہو اس نے ان کی تعظیم وتوقیر میں فرق کیا تو غصہ کی حالت میں اپنے استغناء کی

حکایتیں بیان کی جاتی ہیں، اور دنیا داروں کی ذلت ایسے طور پر بیان کی جاتی ہے کہ وہ شرمندہ ہوکر جبری تعظیم پر مجبور ہوتا ہے، اور جب اچھی طرح آؤ بھگت کرنے لگے تو زمرۂ معتقدین میں شریک ہوکر ہر طرح اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے

الحاصل ''فقر اختیاری'' جن لوگوں کو حاصل ہے آجکل وہ بہت ہی شاذ و نادر ہیں باقی ان کے طفیلی ہیں لیکن کسی سے بدگمانی کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں:

ہرکرا جامہ پارسا بینی
پارسادان و نیک مرد نگار

یہ کرامتِ فقر اختیاری کامل طور پر حضرت امام الاولیاء علی کرم اللہ وجہہ کو حاصل تھی۔عمرؓ کے زمانہ میں سخت قحط سالی ہوئی آپ حضرت عباسؓ کو لے کر جنگل میں گئے اور بارگاہِ الٰہی میں دعا کی کہ: الٰہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی برکت سے پانی برسا! ہنوز لوگ دعاء سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ابر نمودار ہوا اور پانی برسنے لگا اور اتنا برسا کہ گھروں کو واپس ہونا مشکل ہوگیا یہ حضرت عباسؓ کی کرامت خدائے تعالی کے نزدیک تھی کہ ان کے وسیلہ سے جو دعاء کی گئی فوراً مقبول ہوگئی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بارگاہ کبریائی میں عرض کی تھی کہ سعد ابن ابی وقاص کا تیر نشانہ پر لگا کرے اور ان کی دعاء مقبول ہوا کرے اس کے بعد جو دعاء وہ کرتے قبول ہوجاتی چنانچہ جنگ قادسیہ میں دمل کی وجہ سے وہ شریک جنگ نہ ہوسکے اور اپنے گھر کی چھت پر سے لڑائی کی حالت دیکھا کرتے! کسی نے اس باب میں کچھ گفتگو کی اور

وہ خبر آپ کی پہونچی آپ نے کہا: الٰہی اس کی زبان اور ہاتھ سے ہمیں بچا! فوراً وہ گونگا اور اس کا ہاتھ شل ہو گیا۔

عمرؓ نے کہا تھا کہ جس حاکم کی کوئی شکایت کرے میں اسے معزول کر دوں گا ،سعد ابن ابی وقاص کی شکایت ہوئی آپ نے انہیں معزول کر کے عمار بن یاسر کو ان کی جگہ بھیجا اور ایک شخص کو روانہ کیا کہ اہل کوفہ سے ان کا حال دریافت کریں! چنانچہ انہوں نے کوفہ کی کل مساجد کے مصلیوں سے دریافت کیا؟ سب نے ان کی تعریف وتوصیف کی مگر مسجد بنی عبس میں جب گئے اور لوگوں سے پوچھا تو ایک شخص کہنے لگا کہ: سعد لشکر کے ساتھ نہیں جاتے تھے اور تقسیم برابر نہیں کرتے تھے،اور فصل قضایا میں عدل نہیں کرتے تھے سعدؓ نے فرمایا: میں بھی تین دعائیں کرتا ہوں کہ الٰہی اگر یہ شخص جھوٹا ہے تو اس کی عمر دراز کر،اور اس کے فقر واحتیاج کو دراز کر،اور اس کو فتنوں میں مبتلا کر،راوی حدیث کہتے ہیں کہ: میں نے اس کو دیکھا ہے کہ اتنا بوڑھا ہوا کہ اس کی بھوؤں بال آنکھوں پر گرتے تھے اور لونڈیوں کو راستوں میں چھیڑتا اور جب اس سے پوچھا جاتا تو کہتا کہ یہ ایک فتنہ وابتلاء ہے جو سعدؓ کی بددعاء کا اثر ہے۔

ابن عمرؓ سفر میں تھے کہ یکا یک شور ہوا کہ راستہ میں شیر بیٹھا ہے! جس کے خوف سے راستہ بند ہو گیا تھا آپ نے نزدیک جا کر اس سے کہا کہ: راستہ سے ہٹ جا! یہ سنتے ہی وہ دم ہلا کر چلا گیا۔

آنحضرت ﷺ نے علاء ابن الحضرمیؓ کو لشکر دے کر بھیجا،سمندر بیچ میں حائل

تھا،مگر وہ دعاء کرتے ہوئے اس کے پانی پر سے گزر گئے۔

خالدؓ نے زہر پی لیا مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا........یہ چند کرامات صحابہؓ کی تھیں اس سے اتنا تو ثابت ہو گیا کہ صحابہؓ سے کرامات صادر ہوتی تھیں،اب رہی یہ بات کہ جس طرح مابعد کے اولیاء اللہ کی کرامتیں بکثرت ہیں اتنی صحابہؓ کی نہیں تو اس کے اسباب امام سبکیؒ نے لکھے ہیں چونکہ یہاں صرف اثبات کرامات کا ذکر ہے اس لئے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ خواہ معجزہ ہو یا کرامت یا امور عادیہ سب کا وجود اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ خدائے تعالیٰ چاہتا ہے مگر بعض اشیاء میں کسی قسم کی عادت ہے اور بعض میں کسی قسم کی،عادت کے خلاف کوئی چیز دیکھی جاتی ہے تو خرق عادت سمجھی جاتی ہے اور لوگ تعجب کی نظر سے اس کو دیکھتے ہیں،حالانکہ وہی چیز بعض کے یہاں عادی ہوتی ہے مثلاً آدمی سامنے رہ کر نظروں سے غائب ہو جائے تو خرق عادت سمجھی جائے گی اور جن ہمیشہ نظروں سے غائب رہتے ہیں اور کبھی نظر بھی آجاتے ہیں اور ان کے یہاں یہ امر قابل تعجب نہیں چنانچہ آکام المرجان میں اعمش سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قبیلہ بجیل کے ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ایک لڑکی ہمارے یہاں تھی اس سے جن کو تعلق پیدا ہوا،اس نے کہا کہ میں مکروہ سمجھتا ہوں کہ ناجائز تعلق اس سے رکھوں اسلئے اس کے ساتھ نکاح کر دیا جائے! چنانچہ نکاح کر دیا گیا ہم نے پوچھا کہ تم لوگوں کو کونسا کھانا اچھا معلوم ہوتا ہے؟ کہا: چاول ہم نے چاول پکا کر اس کی دعوت کی جب

کھانا رکھا گیا تو صرف لقمے اٹھتے ہوئے نظر آتے تھے اور کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا، ایک روز وہ ظاہر ہوا ہم نے کہا کہ تم کس قسم کے لوگ ہو؟ کہا: تم جیسی ہی ایک امت اور گروہ ہیں جس طرح تم میں قبائل ہوا کرتے ہیں ہم میں بھی ہیں ہم نے کہا کہ کیا اہل ہوا بھی تم میں ہیں؟ کہا ہاں ہر فرقہ کے لوگ یعنی قدریہ شیعہ، مرجیہ ہیں، ہم نے پوچھا: تم کس فرقہ کے ہو؟ کہا مرجیہ، کہا رافضیوں کو تم لوگ کیسے سمجھتے ہو؟ کہا سب سے بدتر۔

اس سے کئی امور معلوم ہوئے ان کا اشکال بدلنا، اور صلاح وتقوی اور مذاہب کی پابندی، اور نگاہوں سے غائب رہنا، اور جب جی چاہے نظر آجانا، معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شکل بدلنا ایسا ہی ہے جیسے ہم لباس بدلتے ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ لباس جزو بدن نہیں بلکہ ہماری ذات سے منفک ہے اور ان کا جسم ان سے منفک نہیں اس صورت میں تشکل باشکل ان کی ماہیت کا خاصہ ذاتی ہوگا یا خاصہ لازمی جس طرح ہمارے لئے ''ناطق'' ہے، ناطق کو ''فصل'' قرار دینے کی ضرورت اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ جتنے انواع حیوانیت میں شریک ہیں سب سے انسان کو امتیاز ہوجائے اور فی الحقیقت ہر اعتبار سے یہی لفظ ممتاز کرنے والا تھا اگر بات کرنے کی صفت لی جائے تو کسی جانور میں نہیں اور اگر دریابندگی معقولات خیال کی جائے تو یہ صفت بھی جس طرح آدمی میں ہے جانور میں نہیں، آدمیوں کے افکار وخیالات سے کروڑہا کتابیں اور دفاتر بھرے ہوئے ہیں اور جانور کو ادراک ہے بھی تو محدود جو ان کی بسر برداوقات کے لئے ہی کافی ہوسکے

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جنوں کی بھی تصانیف ہیں یا نہیں؟ مگر امام شعرانیؒ کے ایک رسالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں چنانچہ اس میں لکھتے ہیں کہ: میرے پاس ایک کاغذ پہونچا جس میں لکھا تھا کہ! ہم بعض امور میں آپ لوگوں کے محتاج ہوتے ہیں اس لئے یہ چند سوالات جو لکھے گئے ہیں ان کے جوابات لکھ کر فلاں مقام میں رکھ دو، اور جواب اگر نظم میں ہو تو مناسب ہے کیونکہ ہم لوگوں کو شعر کے ساتھ بالطبع مناسبت ہے چنانچہ امامؒ نے ایک رسالہ نظم میں لکھ کر رکھ دیا جس کو ایک بلی لے گئی ۔

آکام المرجان میں لکھا ہے کہ ابی ابن کعبؓ سے روایت ہے کہ ایک قوم بارادۂ مکہ معظّمہ نکلی کسی جنگل میں سب نے راستہ بھول کر اس قدر پریشانی اٹھائی کہ موت کی صورت آنکھوں میں پھر گئی اور کفن پہن کر لیٹ گئے ایک شخص جھاڑی میں سے نکلا اور کہا: میں ان جنوں میں سے ہوں جنہوں نے نبی ﷺ سے قرآن سنا تھا اور میں نے حضرت ﷺ سے یہ بھی سنا ہے کہ **المؤمن اخو المؤمن و دلیله لا یخذله** یعنی ایک ایماندار دوسرے ایماندار کا بھائی اور اس کو راہ دکھانے والا ہے برے وقت میں اس کو مخذول نہ کرے یعنی اس کی مدد کرنی چاہیئے اس کے بعد کہا کہ: پانی قریب ہے! چنانچہ ان کو ہمراہ لیکر پانی پر پہونچا دیا۔

اسی طرح اور کئی واقعات نقل کیئے ہیں جن میں احادیث شریفہ کا بیان کرنا اور ان پر عمل کرنا مذکور ہے غرضکہ اتنا ثابت ہے کہ جن میں علماء بھی ہوتے ہیں اور ’’قوت

فکریہ'' بھی ان کو دی گئی ہے اس صورت میں ان کو ''حیوان ناطق'' کہنے میں کوئی تامل نہیں۔

حکماء نے دیکھا کہ اگر واقع میں جن کا وجود ہو بھی جیسا کہ اکثر فلاسفہ اس کے قائل ہیں تو چونکہ وہ نظر نہیں آتے اس لئے ان کی حقیقت اور ماہیت کو نظر انداز کر دیا ورنہ انسان کی ماہیت حیوان ناطق کبھی قرار نہ دیتے حکمت میں چونکہ امور واقعیہ سے بقدرِ طاقتِ بشری بحث ہوتی ہے اور ''جن'' کا وجود خارجی ہے اور مشاہدات سے ثابت ہے جس کے علمائے یورپ بھی قائل ہو چکے اور ہوتے جا رہے ہیں اس لئے اب انسان کی ماہیت حیوان ناطق نہیں ہو سکتی، اب تک جو فصل کہی جاتی تھی یعنی ''ناطق'' وہ عرض عام ہو گئی اور اب کوئی دوسری فصل مقرر کرنے کی ضرورت ہے، اس سے ظاہر ہے کہ فلسفہ تلاحق افکار سے کتنا ہی مستحکم بنایا جائے قابل اعتماد نہیں ہو سکتا، اور عقلاء نے جو حقائق اشیا قرار دیئے ہیں وہ قطعی نہیں ہو سکتے، ہر چیز کی حقیقت وہی جانتا ہے جس نے ان کو پیدا کیا اسی وجہ سے بزرگان دین کی دعاء ہے **اللھم ارنا حقائق الاشیاء کماھی**۔

آکام المرجان میں لکھا ہے کہ علامہ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر حنبلی نے لکھا ہے کہ: مکہ معظّمہ میں جو نہر جاری کی گئی ہے اس کا واقعہ یہ ہے جس کی خبر مجھے امام حنابلہ نے دی جن کے ہاتھ پر نہر کا کام انجام پایا، انہوں نے کہا جب ایک خاص مقام تک نہر کھودی گئی تو نہر کھودنے والا بے ہوش ہو گیا اور وہ کچھ بات نہیں کر سکتا تھا بہت دیر

تک وہ اسی حالت میں پڑا رہا پھر غیب سے ایک آواز آئی کہ ”اے مسلمانو! تم کو حلال نہیں کہ ہم پر ظلم کریں“ میں کہا ہم نے کیا ظلم کیا ہے: کہا ہم یہاں کے رہنے والے ہیں خدا کی قسم سوائے میرے یہاں کوئی مسلمان نہیں میں نے سب کفار کو زنجیروں میں جکڑ دیا ہے ورنہ وہ تمہیں سخت صدمہ پہونچاتے انہوں نے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس زمین میں سے ہم تمہیں پانی ہرگز لے جانے نہ دیں گے جب تک کہ تم ہمارا حق نہ دو میں نے کہا: تمہارا حق کیا ہے؟ کہا ایک بیل لو اور اس کو اعلیٰ درجہ کی زینت سے آراستہ کر کے مکہ میں سے اس کو جلوس نکال کر اس مقام تک پہونچا دو پھر اس کو ذبح کر کے اس کا سر اپایہ اور خون بئر عبدالصمد میں ڈال دو اور باقی کے تم مختار ہو اگر ایسا نہ کروگے تو ہم اس نہر کو کبھی جاری ہونے نہ دیں گے، میں نے قبول کیا یہ کہتے ہی اس شخص کو جو بے ہوش پڑا تھا افاقہ ہوگیا دوسرے روز جب میں صبح کی نماز کے لئے مسجد کو جانے کی غرض سے اترا تو دیکھا کہ ایک شخص دروازہ پر کھڑا ہے اس نے مجھ سے کہا کہ: میں نے آج خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑے بیل کو اقسام کے زیور ولباس سے آراستہ و پیراستہ کر کے شان وشوکت سے خلیفہ کے گھر پر لے گئے اور وہ اس کو ہانکتا ہوا تجمل کے ساتھ مکہ معظّمہ کے باہر لے گیا اور اس کو ذبح کر کے اس کا سر اور پائے کسی کنویں میں ڈال دئے مجھے اس خواب سے تعجب ہوا، اہل مکہ کے روادار لوگوں سے بیان کیا چنانچہ سب نے ایک بیل خرید کر اسے زینت ولباس سے آراستہ کیا اور تجمل سے اس مقام تک لے جا کر ذبح کیا اور جس کنویں کی نشاندھی کی گئی تھی اس میں اس کا سر اور

پائے اور خون ڈال دیا گیا اس وقت تک پانی کا پتہ نہ تھا خون وغیرہ کنویں میں ڈالتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ کسی شخص نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک مقام پر کھڑا کر دیا ہے اور کہہ رہا ہے یہاں کھودو! جب وہاں کھودا گیا تو پانی اس کثرت سے نکلا کہ موجیں مارنے لگا اور ایک نہر نمایاں ہوئی جس میں سوار جا سکتا تھا، ہم نے اس کو صاف کیا اس کثرت سے اس میں پانی جاری ہوا کہ اس کی آواز سنی جاتی تھی اور چار ہی روز میں مکہ معظّمہ نہر مکہ معظّمہ میں جاری ہوگئی۔

علامہ شمس الدینؒ نے لکھا ہے کہ: یہ واقعہ نظیر اس واقعہ کی ہے کہ ایک لڑکی زیور ولباس سے آراستہ کر کے نیل میں ڈالی جاتی تھی عمرؓ نے اس رسم کو بالکل موقوف فرمایا اس واقعہ میں بھی کوئی عمری مشرب ہوتا جس سے شیطان ڈرتے تو نہر جاری ہو جاتی اور ایک چڑیا کو بھی ذبح کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، لیکن ہر زمانہ کے لوگ جدا ہیں لکھا ہے کہ: اس واقعہ کو بیان کرنے والے نہایت سچے اور دیندار اور بڑے متدین شخص تھے جن کے صدق و دیانت پر تمام اہل شہر گواہی دیتے ہیں۔

آکام المرجان میں اسی واقعہ میں لکھا ہے کہ وہب لکھتے ہیں کہ: کسی خلیفہ نے چشمہ جاری ہونے کے لئے جن کے لئے جانور ذبح کیا اور لوگوں کو کھلایا جب یہ خبر ابن شہابؒ کو پہونچی تو انہوں نے کہا کہ: یہ ذبح کرنا اس کو حلال نہ تھا اور لوگوں کو جو کھلایا اس کا کھانا ان کو حلال نہ تھا یہاں وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی بحث پیدا ہوتی ہے جو ہندوستان میں ایک معرکہ آرا مسئلہ ہو گیا ہے کہ اس قسم کے ذبیحہ کو بعض حلال کہتے ہیں

اوربعض حرام !طرفین سے اس مسئلہ میں رسالہ لکھے گئے ہیں اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اس زمانہ میں بھی مختلف تھا کیونکہ علمائے مکہ معظّمہ نے اس کو جائز رکھا اورابن شہابؒ نے حرمت کی رائے دی۔

بہر حال جنوں کے مختلف حالات ہیں اگر وہ سب لکھے جائیں تو ایک ضخیم کتاب ہوجائے گی اس لئے ان ہی چند حالات پر اکتفاء کرنا مناسب سمجھا گیا۔

من الجنة و الناس کے معنی میں اختلاف ہے قول صحیح یہی ہے کہ وہ بیان اوروسواس ہے یعنی وسوسہ انداز جو جن بھی ہوتے ہیں اور آدمی بھی ان سے میں پناہ مانگتا ہوں۔

ابن تیمیہؒ نے تفسیر معوذتین میں یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نعوذ باللہ من شیاطین الانس و الجن ابودرداءؓ نے پوچھا: کیا آدمی بھی شیاطین ہوتے ہیں؟ حضرت ﷺ نے فرمایا: ہاں شیاطین جن سے بھی وہ بدتر ہیں بدتر ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ شیاطین انس دوستی کے پیرایہ میں ہوتے ہیں اور ہم جنس ہونے کی وجہ سے آدمی ان کی طرف مائل بھی ہوتا ہے کما قال: الجنس یمیل الی الجنس ،شیاطین انس وہی ہوتے ہیں جن کی طبیعت برے کام اور شر وفساد کی طرف مائل ہوتی ہے جو لوگ ان کی صحبت اختیار کرتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ ان کو بھی وہ اپنا ہم مشرب بنا ڈالیں۔

پھر ہر نفس کا یہی لازمہ ہے کہ کچھ نہ کچھ وسوسے ڈالتا رہتا ہے جیسا کہ اس

آیت شریفہ سے معلوم ہوتا ہے **وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَاتُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُه** یعنی نفس جو وسوسہ ڈالتا ہے اس کو خدا جانتا ہے اور حدیث شریف سے ثابت ہے کہ آدمی کا نفس دشمنوں میں سب سے بڑا دشمن ہے، پہلے تو نفس ہی خود وسوسہ انداز ہے پھر جب شیاطین الانس سے صحبت اور رفاقت حاصل ہو تو پھر کیا کہنا **ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ** کا مضمون صادق آجاتا ہے۔

اس لئے آدمی کو چاہئے کہ صلحاء کی صحبت اختیار کرے تا کہ ان کی صحبت کی برکت سے نفس کے خیالات درست ہو جائیں اور اچھے وسوسے ڈالنے لگے، احادیث میں اہل بدعت وہواء کی صحبت سے سخت ممانعت وارد ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ جب آدمی ان کی صحبت میں بیٹھے گا تو وہ ضرور برے وسوسے ڈالیں گے جس سے اس کا نفس متاثر ہو کر ان کا ہم خیال ہو جائے گا چنانچہ یہ امر مشاھد ہے کہ کیسا ہی بے اصل اور خلاف عقل ونقل مذہب ایجاد کیا جاتا ہے

لوگ فوری اس میں داخل ہو جاتے ہیں! اور وساوس شیاطین الانس ایسے راسخ ہو جاتے ہیں کہ قرآن وحدیث بھی ان کے روبرو پڑھے جائیں تو ان کو جنبش نہیں ہوتی۔

مذہب سے اصلی غرض یہ ہے کہ آدمی اسکا پابند ہونے کی وجہ سے مرنے کے بعد ہمیشہ راحت وآسائش میں رہے اتنی بڑی دولت مفت میں حاصل نہیں ہوسکتی، اس کے لئے بڑی کوشش درکار ہے جب تک آدمی وساوس شیاطین جن وانس سے احتراز نہ کرے یہ دولت حاصل نہیں ہوسکتی، اس کا حقیقی علاج بغیر اس کے کوئی نہیں کہ آدمی

پورے طور پراللہ تعالی کی پناہ میں آجائے جیسا کہ اس سورہ میں صراحتاً ارشاد ہے۔

نسأ ل الله تعالى التوفيق

بسم الله الرحمن الرحيم

مسئلہ وحدۃ الوجود

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام

على حبيبه ورسوله سيدنا محمد وآله واصحابه اجمعين

یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر چیز پیدا ہونے سے پہلے معدوم ہوتی ہے، اور جس وقت پیدا ہوتی ہے یکا یک محسوس ہوجاتی ہے، اب یہاں دیکھنا یہ ہے کہ کس چیز نے اسے محسوس بنادیا؟ اور وہ کیا چیز ہے جس کے نہ ہونے سے وہ معدوم تھی، اور اس کے ہونے سے محسوس ہوگئی۔

ادنی تامل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ ''وجود'' ہی ہے جو حالت ''عدم'' میں اس چیز سے متعلق نہ تھا، اور جب دونوں میں باہمی تعلق ہوا تو وہ چیز محسوس اور موجود ہوگئی عقل اس پر گواہی دیتی ہے کہ جو چیز ایسی ہو کہ اس کے وجود سے ''معدوم'' چیز ''موجود'' ہوجائے وہ اعتباری نہ ہوگی بلکہ مستقل بالذات ہوگی، اس سے ثابت ہے کہ وجود جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے وہ مصدری نہیں کیونکہ ''وجود مصدری'' ایک اعتباری اور انتزاعی چیز ہے جس کا منشائے انتزاع دوسری چیز ہوگی۔

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ دوسری چیز نفسِ شئے معدوم ہے یا اور کچھ؟ اگر نفسِ شئے معدوم ہو تو لازم آئے گا کہ معدوم من حیث ہو معدوم سے وجود خیال میں آئے! جو کسی طرح درست نہیں! تو لازمی ہے کہ وہ دوسری شئے وجود مصدری کا منشائے انتزاع ہے وہ نفس وجود ہوگا مگر مصدری نہ ہوگا، بلکہ ایسا مستقل ہوگا کہ معدوم شئے کو وجود دے سکے اور اس کی موجودیت کا منشائے انتزاع بنے۔

غرضکہ یہ وجود وجود مصدری کا منشاء انتزاع ہے اور خارج میں موجود ہے، اس وجود کا معنی ''ہونا'' نہیں ہوسکتا جو معنائے مصدری ہے، بلکہ اس کا معنی ''ما بہ الموجودیت'' ہے، گو اس کی حقیقت سمجھ میں نہ آئے مگر اتنا تو ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ ہر شئے معدوم کے موجود ہونے کے وقت ایک چیز ایسی اس کے ساتھ متعلق ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس پر موجودیت کا اطلاق ہوجاتا ہے۔

جب وجود کے دو معنے معلوم ہوئے تو اب ہم جہاں ''وجود'' کہیں گے تو اس

سے مراد ''مابہ الموجودیت'' لیں گے۔

جب آپ سمجھ گئے تو جو معدوم شئے وجود میں آتی ہے وہاں دو چیزیں ہوں گی ،ایک وہ معدوم جس کو وجود مل رہا ہے، دوسرا وجود جس کی وجہ سے وہ معدوم شئے وجود میں آرہی ہے،تو اب تمام موجوداتِ عالم کا حال معلوم ہو گیا کہ اگر وجود سے قطع نظر کر لیجئے تو وہ سب معدوم ہے،اور اس کا موجود ہونا صرف وجود کی برکت سے ہے۔

اب یہاں یہ بات معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ عالم میں بے انتہاء چیزیں ہم دیکھتے ہیں جو شکل وشمائل میں ایک دوسری سے ممتاز ہیں،اس کثرت کا منشاء آیا وجود سے ہے یا وہ معدومات؟ اس میں شک نہیں کہ ''وجودمصدری'' میں کثرت ضرور ہے کیونکہ اس کا منشاء ہر ایک ''موجود'' ہے جو دوسرے سے تشخص میں ممتاز ہے،مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ''وجودخارجی'' اوراصلی یعنی ''مابہ الموجودیت'' میں کثرت ہے، کیونکہ اس کی خاصیت تو یہ ہے کہ جس ''معدوم'' کے ساتھ ملا اس کو ''موجود'' کردیا،اس سے ظاہر ہے کہ کثرت اشیائے معدومہ میں ہے۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اشیائے معدومہ تو معدوم ہیں اور ''عدم'' میں امتیاز سمجھ میں نہیں آتا؟ تو اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ مثلاً زید جو ''موجود'' ہوا حالت ''عدم'' میں ''زید معدوم'' تھا یعنی عدم محض نہ تھا،اسی وجہ سے اس کو ''زید معدوم'' کہنے کی ضرورت ہوئی ، دیکھئے جب ہم گھر بناتے ہیں تو پہلے اس کا نقشہ ذہن میں لاتے ہیں پھر خارج میں اس کو موجود کرتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ خارج میں معدوم گھر وجود میں آیا

نہ یہ کہ مطلق معدوم یعنی عدم محض، مقصود یہ ہے کہ گو گھر خارج میں معدوم ہے مگر عدم محض نہیں، اگر عدم محض ہوتا تو یوں کہتے کہ عدم کو ہم وجود میں لائے، حالانکہ کہا جاتا ہے کہ معدوم گھر کو ہم نے موجود کیا، پھر وہ معدوم گھر جب وجود میں آیا تو جس قدر آثار ولوازم اس کے خیال کئے گئے تھے ان سب کا وجود خارج میں آ گیا، حاصل یہ کہ ''موجود گھر'' کے وجود سے اگر قطع نظر کیا جائے تو صرف ''گھر'' رہ جائے گا جو قبل وجود ''معدوم'' تھا اور بعد وجود ''موجود'' ہو گیا، اسی کو گھر کا ''عین ثابت'' کہیں گے گو کہ حالت عدم میں موجود نہیں مگر من وجہ اس کو ثبوت کا ایک درجہ حاصل ہے جس کو وجود نہیں کہہ سکتے۔

جب ہی موجود میں دو چیزیں پائی جاتی ہیں، ایک ''موجود'' دوسری ''عین ثابت'' پس معلوم ہوا کہ کثرت موجودات صرف اعیان ثابتہ کی کثرت سے ہے ورنہ نفس وجود صرف ایک ہی ہے اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ تمام عالم کے اعیان ثابتہ پر وجود محیط ہے اور وجود ان پر ایسا ہے جیسے چادر مختلف اشیاء پر اڑھادی جاتی ہے، اور ان اعیان ثابتہ کا ظہور صرف وجود کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

اب تمام عالم کو خیال کر لیجئے کہ کہیں زمین ہے کہیں پانی اور کہیں ہوا اور افلاک (کائنات) وغیرہ، اس مجموعہ میں وجود موجود ہے جو ایک ہی ہے مگر ہر ایک چیز کا عین ثابت علیحدہ علیحدہ ہے، اور جتنے آثار ولوازم ہر ایک کے ہیں وہ سب ہر ایک کے عین ثابت میں مندرج و مندمج ہیں ان کو وجود سے کوئی تعلق نہیں، اور تعلق ہے تو اس قسم کا کہ ان کا ظہور بغیر وجود کے ممکن نہیں۔

محققین وجود ہی کو ’’ذات الٰہی‘‘ کہتے ہیں جو تمام عالم کا ’’مابہ الموجودیت ‘‘ ہے، کیونکہ اسی سے ہر چیز کی موجودیت متعلق ووابستہ ہے، گو شریعت میں اس لفظ کا اطلاق ذات الٰہی پر وارد نہیں مگر معنی ضرور صادق آتے ہیں اور عقل بھی اس کو تسلیم کرتی ہے، والعبرۃ للمعنی۔

اس صورت میں مثلاً زید بلکہ تمام عالم معدوم ہے، اور موجود ہے تو اس وجہ سے کہ وجود کے ساتھ اس کو ایک تعلق خاص ہے، اگر وہ تعلق اٹھ جائے تو اس کو پھر کسی طرح موجود نہیں کہہ سکتے، اب اگر ظاہر ہے تو وجود ہی ہے کیونکہ معدوم بحیثیت عدم ظاہر نہیں ہوسکتا، اگر اس کو ظہور ہے تو تعلقِ وجود کے طفیل سے ہے، اس لحاظ سے بندہ اپنے کو فانی اور غیر موجود کہہ سکتا ہے، اور اس لحاظ سے کہ وجود کے ساتھ اس کو تعلق خاص ہے اور نظر صرف وجود کی طرف کرے تو ’’ہمہ اوست‘‘ کا مضمون بھی صادق آتا ہے، اسی وجہ سے بزرگان دین کے اقوال دونوں قسم کے وارد ہیں، حضرت شیخ اکبرؒ نے متعدد مقامات میں فرمایا ہے ماانت ھو انت ھو۔

اگر کوئی اس خیال سے کہ ’’وجود‘‘ واحد ہے اور بزرگان دین نے ’’ہمہ اوست‘‘ فرمایا ہے اپنی حقیقت جو عین ثابت ہے پیش نظر نہ رکھے اور یہ کہے کہ ہمیں عبادت کی ضرورت نہیں تو حضرات صوفیہ کے نزدیک بھی وہ کافر ہے، کیونکہ خدائے تعالی نے صاف فرمایا ہے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون اور جگہ جگہ عبادت کی تاکید فرمائی ہے، اور نصوص قطعیہ کے انکار سے حضرات صوفیہ کے پاس بھی

آدمی کافر ہوجاتا ہے اور وحدت وجود سے اس کو کوئی نفع نہ ہوگا، کیونکہ باوجود وحدت وجود کے دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ آگ برابر جلاتی ہے اور اس سے درد و مصیبت ہوتی ہے، اسی طرح قیامت میں بھی عذاب الیم ہوگا، اگر وحدت وجود کا مقتضی یہ ہوتا کہ کسی کو اذیت اور ضرر نہ ہوتو دنیا میں بھی اذیت نہ ہوتی، اور یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وحدت الوجود کا اثر قیامت ہی میں ہوگا، کیونکہ وجود دنیا و آخرت میں ایک ہی ہے، مقتضائے ذاتی اس کا بدل نہیں سکتا، ہاں یہ بات اور ہے کہ کثرت عبادت سے کنت سمعه وبصره کے مقام تک پہونچ جائے، لیکن اس کا وحدت الوجود سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ کثرت عبادت کا ثمرہ ہے.

هذا من افادة العالم العارف بالله مولانا الحافظ الحاج المولوی محمد انوار الله مدظله العالی وعم فیضه المتعالی بدوام الایام واللیالی فی اثبات وحدة الوجود.

بسم الله الرحمن الرحیم

مسئلہ خلق افعال

الحمد لله رب العالمین والصلاة والسلام علی حبیبه ورسوله سیدنا

محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین:

اہل علم پر پوشیدہ نہیں کہ مسئلہ خلق افعال ایک معرکہ آرا مسئلہ ہے اور اس کے سمجھنے میں بڑی بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں، چونکہ شرع شریف میں یہ مسئلہ مہتم بالشان ہے اور اکثر حضرات اس میں ایسی گفتگو کرتے ہیں کہ شریعت سے دور جا پڑتے ہیں، اس لئے یہ چند اوراق بغرض خیر خواہی اہل اسلام لکھے جاتے ہیں، ناظرین سے توقع ہے کہ تاوقتیکہ اول سے آخر تک بنظر غامض اس کو ملاحظہ نہ فرمالیں اعتراض کی فکر میں مشغول نہ ہوں۔

وما علینا الا البلاغ

علماء نے لکھا ہے کہ جب ابتداءً کسی کام کے کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کو ''ہاجس'' کہتے ہیں، اور تھوڑا سا قرار و قیام ہو جانے پر اس کا نام ''خاطر'' ہوتا ہے، پھر اگر اس کام کے کرنے یا نہ کرنے میں تردد ہو تو اس کو ''حدیث نفس'' کہتے ہیں، اور اگر کرنے کی جانب کو ترجیح ہو جائے تو وہ ''ہم'' ہے اور جب پورا قصد کر کے وہ کام شروع کر دیا جائے تو اس کو ''عزم'' کہتے ہیں۔

یہاں تک تو مدارج اس خیال کے ہوئے جو ابتداءً دل میں پیدا ہوتا ہے، اس کے بعد فعل جس قسم کا ہو (خواہ جوارح سے متعلق ہو یا دل سے) شروع ہو جاتا ہے، اور جب تک وہ کام ختم نہ ہو قصد باقی رہتا ہے، اگر چہ بظاہر اس خیال ابتدائی کے ساتھ

فعل کو چنداں مناسبت نہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ دونوں میں علم ومعلوم کی نسبت ہے،اور دونوں آدمی کے حالات ہیں ،صرف فرق یہ ہے کہ وہ کیفیت علمیہ ہے اور یہ حالتِ جوارح وغیرہ ،اوروہ بمنزلۂ تخم ہے اور یہ بمنزلۂ درخت ،جس طرح درخت بغیرتخم کے نہیں ہوسکتااسی طرح فعل اختیاری بغیراس خیال کےنہیں ہوسکتا ،اور جیسے تخم بغیر وجود شرائط کے درخت نہیں بنتا ویسے ہی وہ خیال بغیر وجودشرائط کے فعل کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا،اگر چہ بظاہر تخم وشجر میں کوئی مناسبت نہیں ہے،اس لئے کہ وہ خشک ہےاور یہ تروتازہ،وہ جماد ہےاور وہ نامی،اس میں رگ وریشہ وبرگ نہیں ہےاوراس میں سب کچھ ہے،وہ بدرنگ بے رونق اور بے مزہ ہےاور یہ خوش رنگ خوش ذائقہ اورخوشبودار ہے،باوجوداس کے عقل گواہی دیتی ہے کہ تخمِ خشک بسبب وجودشرائط کے درخت ہورہا ہے،اسی طرح اگرغورکیا جائے تو وہی خیالِ اولیں جودرجہ ’’ہاجس‘‘میں تھابسببِ وجود شرائط کےصورتیں بدلتا ہوا گویافعل بن رہاہے۔

اب اس سلسلے پرغورکرنا چاہئے کہ ابتدائے وجودِخیال سے انتہائے وجودِفعل تک آدمی کے اختیارات اورقوت کوکہاں تک دخل ہے؟ یہ توہرشخص جانتاہے کہ ابتداءً جو خیال پیدا ہوتاہےتواچانک آتاہے،بسااوقات آدمی چاہتاہے کہ کوئی خیال ہی نہ آنے پائےمگروہ آہی جاتاہے،اس سے ظاہر ہے کہ خیالات کے باب میں آدمی کس قدرمجبور ہے۔

یہ وجدانی دلیل تھی،عقلاً اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ خیالِ ابتدائی قبلِ وجودممکن

ہے، یعنی نہ اس کا وجود ضروری ہے نہ عدم، اور یہ مسلم ہے کہ ممکن جب تک بسبب ترجیح جانب وجود کے واجب بالغیر نہیں ہوتا وجود میں نہیں آ سکتا، پھر یہ بھی بدیہی ہے کہ ممکن سے واجب صادر نہیں ہوسکتا، کیونکہ علت کا مرتبہ معلول سے ارفع ہوتا ہے، اسی وجہ سے ممکن نہیں کہ اس خیال کا وجود اس شخص سے یا کسی دوسرے ممکن سے ہو سکے، تو لازمی ہوا کہ وہ اپنے وجود میں مثل اور ممکنات کے واجب تعالی کا محتاج ہو اور جب تک حق تعالی اس کو وجود عطاء نہ فرمائے وہ موجود نہ ہو سکے۔

ایک واضح دلیل اس دعوے پر یہ ہے کہ اگر اس ابتدائی خیال کو آدمی اپنے اختیار سے پیدا کرتا ہوتا تو چاہئے تھا کہ پہلے اس خیال کا خیال بھی آتا، کیونکہ جو کام اختیار سے کیا جاتا ہے اس کو پہلے سے جان لینا ضروری ہے تاکہ وہ سوچ اور سمجھ کر کیا جائے، پھر وہ خیالِ خیال بھی اختیاری ہوتا تو اس کا بھی خیال پہلے ہی سے ہونا چاہئے، علی ھذا القیاس یہ سلسلہ غیر متناہی جاری ہو جائے گا جو باطل ہے، کوئی عاقل یہ تسلیم نہیں کرسکتا کہ ایک خیال کے واسطے اتنے خیالات یا چند ہی خیالات پہلے ہی سے موجود ہو جاتے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ جو خیال آتا ہے وہ بلا اختیار آتا ہے۔

غرض ان دلائل سے ثابت ہوا کہ ''ہاجس'' محض بخلقِ خالق ہے، علامہ صدرالدین شیرازی نے اسفار اربعہ میں محققین حکماء کا قول نقل کیا ہے کہ قول المحققین منهم ان المؤثر فی الجمیع هو الله بالحقیقة، پھر اس کا ثابت و باقی رکھنا بھی خدائے تعالی ہی کا کام ہے، کیونکہ آدمی کسی چیز کو معدوم محض نہیں کرسکتا، البتہ کسی چیز کی

صورت بدل سکتا ہے، جب اعدام پر آدمی کی قدرت نہ ہوئی تو وجود اس کا بحفظِ الٰہی اپنی حالت اصلی پر باقی رہے گا جب تک خدائے تعالیٰ اس کو خود معدوم نہ کرے، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ ہر وقت کے ہواجس صرف خدائے تعالیٰ کی خلق سے ہیں تو ممکن تھا کہ جب تک حدیث نفس کی نوبت پہونچے کوئی دوسرا ہاجس پیدا ہو جاتا جس سے وہاں تک کی نوبت ہی نہ پہونچتی، اس ہاجس کو اس درجہ تک نشو و نما دینا بھی خدا ہی کا کام ہوا، اس کے بعد جب تردد کی نوبت پہونچتی ہے جو حدیث نفس ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ کبھی تو فعل کی جانب راجح ہو جاتی ہے اور کبھی ترک کی، اگرچہ یہ دونوں کیفیتوں کے مجموعے کا نام "حدیث نفس ہے" مگر علیحدہ علیحدہ دونوں جانبوں کو دیکھئے تو وہاں بھی وہی ہاجس کی سی کیفیت ہے کہ یکایک کبھی فعل کی ترجیح ہو جاتی ہے، پھر ترک کی، پھر فعل کی، ہر ایک کیفیت کا حدوث بلا اختیار ہوتا ہے جس کی خلق بحسب دلائل سابقہ حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، گو منشاء اس کا ہر جانب کے منافع و مضار کا خیال ہوتا ہے مگر اس خیال کی بھی وہی کیفیت ہے جو ہاجس کی تھی، کیونکہ جب منافع و مضار دونوں اس میں ہوں تو پہلے دونوں میں سے کسی ایک کے لئے مرجح چاہئے اور وہ آدمی نہیں ہو سکتا ورنہ تسلسل لازم آئے گا، جس کا حال اوپر گزرا، اس سے معلوم ہوا کہ وہ خیال نفع یا ضرر جو حدیث نفس میں پہلے آیا وہ بھی مثل ہاجس کے بہ خلق الٰہی ہوگا، اس طرح دوسرا خیال پھر اس کے بعد ہم و عزم پیدا ہوتے ہیں وہ بھی ان ہی دلائل سے مخلوق خالق ہیں کیونکہ ان کا وجود بھی حادث ہے، الحاصل یہ تمام سلسلہ عزم و قصد تک بخلق خالق ہونا دلائل عقلیہ

ونقلیہ سے ثابت ہے۔

پھر عزم کے متصل فعل شروع ہوتا ہے،اس کی کیفیت حکماء کے پاس اسطرح ہے جیسا کہ شیخ نے قانون میں لکھا ہے:

حرکت ارادی جواعضاء سے متعلق ہےاس کی تکمیل اس وقت سے ہوتی ہے جو دماغ سے بواسطۂ اعصاب اعضاء میں پہونچتی ہےاس کی صورت یہ ہے کہ عضلات جواعصاب اورر باطات وغیرہ پر مشتمل ہیں جب سمٹ جاتے ہیں تو وتر (جو رباط وعصب سے ملتئم اوراعضاء میں نفوذ کئے ہوئے ہے) کھینچ جاتا ہے،جس سے اعضاء بھی کھینچ جاتے ہیں،اور جب عضلہ منبسط ہوتا ہےتو وتر ڈھیلا ہوجاتا ہےاور عضودور ہوجاتا ہے۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ نفس ادراک کے بعد کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو عضلات کو جوجسم آدمی پانچسو انتیس (۵۲۹) ہیں کشش وغیرہ دے کر کسی عصبِ خاص کے ذریعے سے جوستہتر (۷۷) ہیں جس عضو کو چاہتا ہے خاص حرکت دیتا ہےجس سے فعلِ مطلوب وقوع میں آتا ہے۔

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ نفس کو سر سے پاؤں تک جس عضو کو حرکت دینا ہوتو ضروری ہے کہ پانچسو انتیس عضلات اور ستہتر (۷۷) عصب میں سے اس عضلے اور اس عصب کو حرکت دینا ہوگا جو اس خاص عضو سے متعلق ہے!اور یہ ظاہر ہے کہ قبل اس کے کہ کسی عضلے اور عصب کو حرکت دیں اس کو معین کرنے کی ضرورت ہےتا کہ خاص اسی کو حرکت دی جائے جس کی طرف توجہ ہے،اور یہ معین کرنا اس بات پر موقوف ہے کہ

پیشتر تمامی اعصاب وعضلات کو بالتفصیل جان لے،اس کی مثال بعینہ ایسی ہوگی جیسے لکھنے کے وقت قلم کو حرکت دینے کے لئے پہلے چند انگلیوں کو معین کرتے ہیں جس سے قلم کو حرکت دینا ہوتا ہے، پھران انگلیوں کو ارادے اور اختیار سے حرکت دیتے ہیں جس سے قلم کو حرکت ہوتی ہے،اس موقعہ پر ہم اہل انصاف سے درخواست کرتے ہیں کہ جس عضو کو چاہیں بار بار مسلسل حرکت دے کر بغور وتعمق اپنے وجدان سے دریافت کریں کہ اس اختیاری حرکت کے وقت کوئی عضلہ یا عصب کی طرف نفس کی (اپنی) توجہ بھی ہوتی ہے یا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اندر کوئی عضلہ یا عصب بھی ہے یا کسی چیز کو ہم کھینچتے ہیں جس سے وہ عضو کھنچتا ہے؟ کوئی اس کی گواہی نہیں دے سکتا کہ اندرونی کیا کیفیت ہے؟ اور وہ عضلات واعصاب کیونکر کھنچتے ہیں؟ میری دانست میں اگر کوئی پوری پوری وجدانی حالت کی ایمان سے خبر دے تو یہی کہے گا کہ اعصاب وعضلات کو میں تو نہیں کھینچتا،ہاں اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم فلاں عضو کو حرکت دینا چاہتے ہیں، پھر ہوتا یہ ہے کہ ادھر توجہ ہوئی اور ادھر اس کو حرکت ہوگئی۔

یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ عصب وعضلے کو حرکت دینا بھی ہمارے اختیار سے خارج ہے، کیونکہ اختیاری حرکت ہوتی تو اس کا علم اور ارادہ بھی ضرور ہوتا،اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ حرکت کا ارادہ بعینہ عصب وعضلے کی حرکت کا ارادہ ہے،اس لئے کہ جب ہمارے وجدان ہی میں نہیں کہ عصب کوئی چیز بھی ہے تو پھر کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ اس کی حرکت کا ارادہ ہوا! پھر جب بحسب تحقیق حکمائے اطباء سے یہ ثابت ہے کہ بغیر عضلات

واعصاب کی حرکت کے کوئی عضو حرکت نہیں کرسکتا، تو ضروری ہوا کہ وہی ملتفت الیہ بالذات ہوں گو مقصود بالذات ان کی حرکت نہ ہو۔

یہ ہاتھ پاؤں کے افعال سے متعلق بحث تھی، اب آنکھوں کے فعل کا حال سنئے کہ دیکھنے کے وقت حدقوں (پتلیوں) کو ایک مناسبت کے ساتھ گھمانے کی ضرورت ہوتی ہے، اس وجہ سے کہ جب تک دونوں آنکھوں کے خطوط شعاعی مرئی پر نہ ڈالے جائیں وہ شئے ایک نظر نہ آئے گی، کیونکہ ہر ایک آنکھ مستقل دیکھتی ہے، اسی وجہ سے احوال (ترچھا) دودو دیکھتا ہے، پھر وہ دونوں خطوط جب مرئی پر جا پڑتے ہیں تو ان دونوں کے ملنے سے وہاں ایک زاویہ پیدا ہوتا ہے، یہ زاویہ جس قدر کشادہ ہوگا مرئی بھی اس قدر بڑا نظر آئے گا، اور جس قدر تنگ ہوگا اسی قدر چھوٹا نظر آئے گا، اسی وجہ سے کسی چیز کو نزدیک سے دیکھیں تو بڑی اور دور سے دیکھیں تو چھوٹی نظر آتی ہے، اس کی تفصیل ہم نے کتاب العقل میں کس قدر شرح وبسط سے لکھی ہے یہاں صرف اسی قدر بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ: جب مرئی کے ایک نظر آنے کا مدار دونوں خطوط شعاعی کے ملنے پر ہے تو مرئیات جس قدر دور یا نزدیک ہوتے جائیں گے حدقوں کی وضع (پوزیشن) بھی بدلتی جائے گی، یہاں تک کہ اگر مرئی بہت ہی نزدیک ہوجائے گا تو حدقے بھی بالکل ناک کی جانب ہوجائیں گے، اور جب وہ بہت دور ہوجائے گا تو وہ کان کی جانب مائل ہوجائیں گے، اب ہم دیکھنے والوں سے پوچھتے ہیں کہ ایک گز یا ہاتھ کے فاصلہ پر حدقے کو کس قدر مائل کرنے کی ضرورت ہے؟ اس کو اپنے وجدان سے بیان کریں! اور

اگر وجدان ساتھ نہیں دیتا تو کسی حکیم ہی کے قول سے ثابت کر دیں کہ اس قدر فاصلے پر کوئی چیز ہو تو حدقوں کو اس وضع پر رہنا چاہیے ، اور اس قدر فاصلے پر ہو تو اتنی حرکت دینا چاہیے !! حالانکہ ہم جب کسی چیز کو دیکھنا چاہتے ہیں تو بغیر اس کے کہ ہم کو اس کا طریقہ معلوم ہو یہ سب کچھ ہو جاتا ہے، ادھر ہماری توجہ ہوئی ادھر آنکھوں نے اپنے موقع پر شست باندھ لی اور نفس ناطقہ کو خبر بھی نہیں کہ یہ کام کس نے کیا۔

علی ہذا القیاس بات کرنے اور پڑھنے کے وقت حلق وزبان وغیرہ کے عضلات واعصاب کو کھینچنا اور ڈھیلے چھوڑنا اور ہر ہر مخرج پر لگانا بغیر اس علم کے کہ کہاں کون سا عضلہ؟ اور کہاں کونسا عصب ہے؟ دلیل واضح ہے اس پر کہ ہمارے اختیار کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

اگر کہا جائے کہ یہ فعل طبیعت سے صادر ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ حکماء نے تصریح کر دی ہے کہ طبیعت بے شعور محض ہے! پھر اس کو کیونکر خبر ہوئی کہ نفس فلاں چیز کو دیکھنا چاہتا ہے اور وہ چیز اس قدر فاصلے پر ہے؟ اور نفس نے فلاں عبارت پڑھنی چاہی ! اگر نفس طبیعت کو یہ سب بتا دیتا ہے تو یہ خلاف بداہت ووجدان ہے، اور بالفرض اگر تسلیم بھی کیا جائے تو خلافِ تحقیق حکماء ہے، اس لئے کہ نفس ان کے وہاں ادراکِ جزئیہ مادیہ نہیں کر سکتا، اور جتنی عضلات اور اعصاب میں سب جزئیات مادیہ ہیں پھر نفس کو ان جزئیات کا ادراک کیونکر ہو سکتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ قدرت یہ سب کام کر لیتی ہے جو نفس کی صفت ہے تو ہم کہیں

گے کہ قدرت ارادے کی تابع ہے اور ارادہ علم کے تابع ہے، جب تک کسی چیز کا علم نہ ہو اس کا ارادہ نہیں ہوسکتا، اور جب تک ارادہ نہ ہو قدرت کچھ نہیں کرسکتی، کیونکہ بغیر ارادے کے اگر قدرت یہ کام کرلے جب کہ آدمی میں ہر کام کی قدرت ہر وقت رہتی ہے تو چاہئے کہ ہر کام ہر وقت ہونے لگے! جس سے دم بھر کی فرصت ملنی مشکل ہو اور آدمی دیوانہ مشہور ہوجائے، پھر ارادہ بغیر علم کے نہیں ہوتا، ورنہ طلب مجہول مطلق کی لازم آجائے گی جو محال ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ تحریک عضلات وغیرہ میں صرف قدرت بیکار رہے ،حاصل یہ ہے کہ فعل کے وقت تحریک عضلات وغیرہ جو ہوتی ہے وہ یا خود بخود ہوتی ہے یا ہمارے ارادے سے یا حق تعالی کے خلق سے، چونکہ یہ مسلم ہے کہ کسی چیز کا وجود بغیر موجد کے نہیں ہوسکتا، اس لئے خود بخود تحریک عضلات ہونا باطل ہے، اور تقریر سابق سے ثابت ہوا کہ حرکت ہمارے ارادے سے بھی نہیں ہوتی، تو اب وہی تیسری صورت باقی رہ گئی کہ حق تعالی حرکت کو اعصاب وغیرہ میں پیدا کردیتا ہے، اور یہ ہونا بھی چاہئے اسلئے کہ حرکت ممکن ہے اور ممکن کے احدالجانبین کو ترجیح دینا اور اس کو واجب بالغیر بنانا حق تعالی ہی کا کام ہے۔

الحاصل فعل کے سلسلے میں ہا جس سے وقوع فعل تک کوئی درجہ ایسا نہیں کہ حق تعالی کا مخلوق نہ ہو، اس سے ثابت ہے کہ جس طرح آدمی کی ذات وصفات مخلوق الہی میں ہیں اسی طرح اس کے جملہ حرکات وسکنات اور افعال بھی مخلوق الہی ہیں، اس تقریر

کے بعد امید ہے کہ معتزلہ کے کل شبہات بشرط انصاف حل ہو جائیں گے، کیونکہ جب بدلائل عقلیہ ونقلیہ یہ بات ثابت ہوگئی کہ کل افعالِ الٰہی ہیں تو پھر کوئی شبہ قابل التفات نہ ہوگا۔

جبریہ کہتے ہیں کہ بندے میں کسی طرح کی قدرت نہیں بلکہ وہ مثل جماد ہے، اور اشاعرہ کا مذہب ہے کہ قدرت تو ہے مگر موہوم جس کا اثر فعل میں نہیں ہوسکتا، اور وہ فعل کے ساتھ ہی ہے مگر موہوم، حنفیہ کا قول ہے کہ قدرت تو بخلقِ خالق موجود ہے لیکن وہ فعل میں اثر نہیں کرسکتی بلکہ فعل کو اللہ تعالی ہی پیدا کرتا ہے، معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ بندے میں قدرت موجود ہے اور ایسی قدرت سے بندہ اپنے افعال پیدا کرتا ہے اور وہ قدرت قبل صدور فعل بھی موجود ہے۔

اس مسئلے میں معتزلہ اور قدریہ نے صرف عقل ہی سے کام لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص جانتا ہے جس پر اس کا وجدان بھی گواہی دیتا ہے کہ اپنے میں کام کرنے کے وقت قدرت ہے، بلندی پر چڑھنے میں اور اوپر سے گرنے میں ہر عاقل فرق کرسکتا ہے کہ ایک اختیار سے ہے اور دوسرا بلا اختیار، اس وجہ سے انہوں نے کہہ دیا کہ فعل بندے ہی کا مخلوق ہے۔

جبریہ نے دیکھا کہ نصوصِ قطعیہ تصریح کررہی ہے کہ کل افعال مخلوقِ باری تعالی ہیں کما قال اللہ تعالی : وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ تو انہوں نے بندے کو مجبور محض اور مثل جماد قرار دے دیا۔

اہل سنت نے دیکھا کہ اس میں جزاء سزا کا معاملہ درہم وبرہم ہوا جاتا ہے اس لئے انہوں نے کسب پر جزاء وسزا کو مبنی کیا جس پر آیت شریفہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا كْسَبَتْ دال ہے، مقصود ان حضرات کا یہ ہے کہ راہ توسط اختیار کی جائے، یعنی افعال مخلوقِ الٰہی ہوں، اور جزاء وسزا کسب سے متعلق ہو۔

حضرات صوفیہ کا مسلک بھی اس سلسلے میں ظاہراً جبریہ کا سا معلوم ہوتا ہے ، چنانچہ ان کی تصریحات سے ایہ امر ظاہر ہے، مگر چونکہ ان کا مسلک ہے کہ حتی الامکان آیات میں تاویل نہ کریں، اس لئے بلحاظ ان آیات کے جن میں عمل کی تاکید ہے اعلی درجے کا عمل میں اہتمام کیا اور اس قدر عمل میں مشغول ہوئے کہ معتزلہ اور قدریہ باوجود اس اعتقاد کے جو مقتضی کمالِ اہتمام عمل ہے اسقدر عمل نہیں کرسکتے، چنانچہ یہ بات ان کے حالات اور تذکروں سے ظاہر ہے، اور اعتقاد میں وہ بالکل جبریہ کا سا اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ ایک حیثیت سے ان پر بھی فائق ہیں، ان کے مسلک پر بھی بندے میں کسی قسم کی قدرت نہیں بلکہ ہر طرح کی قدرت خدائے تعالی ہی کے لئے مسلم ہے اور مختار وہی ہے ، بندے کے اختیار کو کوئی دخل نہیں، چنانچہ ارشاد ہے وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَايَشَآءُ وَيَخْتَارُ. مَاكَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ. سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّايُشْرِكُوْنَ .

یہ تو باتفاق اہل سنت وجماعت ثابت ہے کہ قدرت اور افعال دونوں حق تعالی ہی کے مخلوق ہیں، اب رہ گیا کسب یعنی قدرت کو صرف کرنا، اس کو بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو آخر وہ بھی فعل قلبی ہے، مثل حدیثِ نفس وتوکل وایمان وغیرہ، اور وہ وَاللّٰهُ

خَلَقَکُمْ وَمَاتَعْمَلُوْنَ میں داخل ہے،اس تقدیر پر کوئی فعل بندہ کا مخلوق واختیاری نہیں ہوسکتا بلکہ بندہ مع جمیع افعال مخلوقِ الٰہی ہے۔

اس مقام پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر بندے کو کچھ اختیار نہ ہو اور ارادہ وغیرہ بھی خدا ہی پیدا کرے تو جبر اور خلاف عدل لازم آئے گا!! اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اعتراض چنداں قابل التفات نہیں ،اس لئے جو لوگ مادرزاد اندھے بہرے، گونگے ،اپاہج اور ضعیف الخلقت پیدا ہوتے ہیں اور ہمیشہ بیمار رہتے ہیں جب ہم جنسوں کو نعمتوں اور صحت میں دیکھتے ہوں گے تو ان کے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی؟ کیا اس کو عذاب نہ سمجھتے ہوں گے؟ اگر بغیر فعل کے عذاب خلاف عدل ہے تو اس خلق کو بھی خلاف عدل کہنا چاہئے!! حالانکہ کوئی اس کا قائل نہیں ہے۔

رہا یہ کہ عذاب اس عالم میں افعال سے متعلق نہیں،اور جو عذاب اس عالم میں ہوگا وہ افعال سے متعلق ہے! سو یہ بحث دوسری ہے، یہاں کلام صرف عدل میں ہے ،ایک بندے کو بلاسبب عذاب میں رکھنا اور دوسرے کو نعمتیں دینا ان کے عقیدے کے مطابق خلاف انصاف ہے۔

الغرض حق تعالی نے جس طرح بعض بندوں کو اقسام کی نعمتیں عطاء فرمائیں اس طرح بعضوں کو توفیق بھی عطاء فرمائی یعنی خیالات بھی ان میں اچھے پیدا کردئے،اور اس کے موافق ان میں افعال بھی پیدا کردئے جس سے وہ قابل تقرب ہوجائیں،اور کسی دوسرے کو اس قابل نہ بنائے تو خلاف عدل کیونکر ہوگا؟ مالک مختار

نے جس کو جو چاہا دیا کوئی اس سے یہ نہیں پوچھ سکتا اور نہ پوچھنا جائز ہوگا کہ اپنی ملک میں یہ کیوں کیا؟ قال تعالیٰ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ، اسی وجہ سے صاف ارشاد فرمایا وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْراً مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْس جب جہنم ہی کے لئے بہت سے لوگوں کو پیدا فرمایا تو ان کے کسب کا اختیاری ہونا کس کام آئے گا!! اس لئے کہ جو شخص قبل عمل بلکہ قبل پیدائش دوزخی ٹھہر جائے تو وہ اختیار سے کیا نفع اٹھا سکتا ہے۔

حکمت جدیدہ والوں کو اس کا یقین ہے کہ آدمی جس چیز کو دیکھتا ہے الٹی دیکھتا ہے، چنانچہ آدمی کا سر اوپر اور پاؤں نیچے سمجھنے کی عادت ہوگئی، یہ خیال ایسا متمکن ہوگیا ہے کہ تمام عالم کا مشاہدہ ایک طرف ہے اور وہ ایک طرف اس خیال کا ان کو ایسا وثوق ہے کہ تعلیم وتعلم میں اس مسئلہ کو داخل کردیا، اسی طرح ہنود کے عقائد اپنے دیوتاؤں کے ساتھ ایسے ہیں کہ کوئی عاقل ان کی تصدیق نہیں کرسکتا، علیٰ ہذا دوسری اقوام اپنے اپنے عقائد مخصوصہ کی تصدیق پوری پوری کرتے ہیں اور کچھ خیال نہیں کرتے کہ وہ خلاف مشاہدہ اور مخالفِ بداہت عقل ہیں، مگر افسوس ہے کہ اہل اسلام باوجود دعوائے اسلام کے حق تعالیٰ کے قول کی تصدیق نہیں کرتے اور اپنی عقل کے مطابق بنانے کے لئے آیات قرآنی میں تاویلیں کرتے ہیں، چونکہ معتزلہ وغیرہ کا استدلال وجدان قدرت پر ہے اس لئے اس کا بھی حال کچھ معلوم کرنا چاہیے:

وجدان اس علم کا نام ہے جو آدمی اپنے میں پاتا ہے چونکہ حواس کو بقول حکماء شعور نہیں اس لئے ان کو وجدان بھی نہ ہوگا، بلکہ بواسطۂ حواس نفس کو ادراک اور اس کا

وجدان ہوتا ہے، مثلاً کوئی عضو جلے یا سرد ہو تو بواسطۂ قوت لامسہ نفس کو گرمی اور سردی کا احساس اور وجدان ہوتا ہے، اسی طرح جملہ حواس اور قوائے متخیلہ وواہمہ وغیرہ نفس کے ادراک کے لئے آلات ہیں اور نفس کو ان تمام ادراکات کا وجدان ہے، جیسے خوشی اور غمی، بھوک اور پیاس وغیرہ کیفیات کا وجدان ہے، چونکہ سلسلۂ فعل ہی میں قدرت بھی قائم کی گئی ہے اس لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ جس طرح ہم کو ہاجس سے عزم تک جمیع مدارج کا وجدان ہے ایسا ہی قدرت کا بھی وجدان ہے یا نہیں؟ جب کسی کام کا خطور ہم میں ہوتا ہے کہ کوئی نئی بات ہم میں پیدا ہوگئی ہے جو پہلے نہ تھی، یہی وجدان ''ہاجس'' ہے، اسی طرح ''عزم'' تک نفس کو ہر درجے کا وجدان ہوتا ہے اور ہر مرتبہ کے مناسب آثار نفس میں بلکہ خارج میں نمایاں ہوتے ہیں، بخلاف قدرت کے اسلئے کہ اس سلسلے میں کوئی نئی چیز ایسی پیدا نہیں ہوتی جس کا نام قدرت رکھا جائے۔

اگر کہا جائے کہ ہر شخص کو کام کرنے کے وقت اس امر کا وجدان ہوتا ہے کہ میں یہ کام کرسکتا ہوں! اس وجہ سے اسی کام کا ارادہ کرے گا جس کے کرسکنے کا وجدان ہوتا ہے اسی کا نام ''وجدان قدرت'' ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ ہر قدرت کا وجدان نہیں بلکہ اس کام کے علم کا وجدان ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے دیوار کا علم حصولی ہے اور وجدان علم حضوری میں ہوا کرتا ہے، اور علم کا وجدان اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ وہ نفس کی کیفیت ہے جس کا علم حضوری ہوتا ہے، اسی طرح کام کرنے کا علم جو قبل فعل ہوتا ہے وہ بھی علم حصولی ہے اسلئے کہ ابھی کام کا وجود ہی نہیں، اور ہوگا بھی تو جوارح سے

ہوگا، پھر اس کا علم حضوری کیونکر ہوگا؟ البتہ اس کے علم کا علم حضوری ہے۔

فعل کا علم ایسا ہے جیسے طبیب حاذق کو بعد ملاحظۂ قرائن واسباب اس امر کا علم رہتا ہے کہ بیمار مر جائے گا یا صحت پائے گا، اور وہ اس کو امر وجدانی سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا وجدان اس پر گواہی دیتا ہے، اسی طرح ہر شخص کا وجدان قرائن کی وجہ سے گواہی دیتا ہے کہ ہم یہ کام کر سکتے ہیں، مثلاً جو شخص گھوڑے کی سواری نہ جانے اور لوگوں کو گرتے دیکھے تو یہ کہے گا کہ میں سواری نہیں کر سکتا، اور جب کئی بار سوار ہوا اور نہ گرے تو اس قرینے سے کہے گا کہ میں سواری کر سکتا ہوں! اگرچہ بظاہر وہ اپنے وجدان کی خبر دیتا ہے کہ مجھ میں سواری کی قدرت ہے مگر دراصل وہ علم استدلالی ہے جو بنظر قرائن حاصل ہوا ہے، اسی طرح بیمار جب چلتا ہے اور بسبب ضعف کے چل نہ سکے تو اس پر قیاس کر کے خبر دیتا ہے کہ مجھ میں چلنے کی قدرت نہیں، پھر جب چند بار چلے اور نہ گرے تو یہ کہتا ہے کہ میں اپنے میں چلنے کہ قدرت پاتا ہوں، اگرچہ یہ بھی وجدان ہی کی خبر دیتا ہے مگر وہ وجدان سے متعلق نہیں بلکہ قیاس اور علم استدلالی ہے، اور یہ وجدان بعینہ ایسا ہے جیسے طبیب کا وجدان بیمار کی صحت یا موت پر ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ جب قرائن سے کسی کام کے کرنے کا علم ہو جاتا ہے تو اس علم کا وجدان بھی ہو جاتا ہے اور آدمی اس کو سمجھتا ہے کہ وہ قدرت کا وجدان ہے، حالانکہ وہ وقوع فعل کے علم کا وجدان ہے، اسی وجہ سے اس میں خطا بھی ہوتی ہے اور وہ علم خلاف واقعہ ثابت ہوتا ہے، مثلاً بسا اوقات آدمی دعوی کرتا ہے کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں اور اس

پراس کواس قدر وثوق واعتماد ہوتا ہے کہ شرط تک باندھ لیتا ہے، پھر باوجوداس کے نہیں کرسکتا، اگراس کوشرط باندھنے کے وقت اس قدرت کا وجدان ہوتا جواس کام کے لئے کافی ہے تو وہ کام ضرور کرسکتا، پھر جب نہ کرسکا تو معلوم ہوا کہ اس کام کی قدرت کا وجدان ہی نہ تھا۔

اگر کہا جائے کہ بھوک کے وقت ایک ایسی حالت کا وجدان ہوتا ہے جس سے آدمی سمجھتا ہے کہ میں کام نہیں کرسکتا، پھر کھانا کھانے کے بعد ایسی حالت پیدا ہوتی ہے کہ اس سے اپنے میں کام کرنے کی قوت پاتا ہے، اور یہ وجدان ایسا ہے کہ کوئی اس کا انکار نہیں کرسکتا ہم اسی قوت کا نام ''قدرت'' رکھ سکتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ کھانا کھانے کے بعد جو حالت طراوت وتازگی پیدا ہوتی ہے وہ نباتات میں بھی ہوتی ہے، دیکھ لیجئے چھوٹے چھوٹے درختوں کو سینچنے میں دیر ہوتو پژمردہ اور مضمحل ہوجاتے ہیں مگر جب ان میں پانی سرایت کرتا ہے تو فوراً ان میں تازگی شروع ہوجاتی ہے اور کمزور مرجھائے ہوئے پتوں میں طاقت آجاتی ہے جس سے وہ کھڑے ہوجاتے ہیں! حالانکہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ درختوں میں قدرت ہے، اسی سے معلوم ہوا کہ طراوت اورتازگی کا نام قدرت نہیں ہوسکتا۔

بات یہ ہے کہ جب حق تعالی کواعضاء سے کام لینا منظور ہوتا ہے تو ان میں مناسب رطوبت ورنہ یبوست مفرطہ پیدا فرمادیتا ہے، مثلاً جب نسیان پیدا کرنا منظور ہوتو خواہ بوجہ پیروی یا اور کسی سبب سے دماغ میں یبوست مفرطہ پیدا فرمادیتا ہے جس

سے نفس ناطقہ نسیان پر مجبور ہوتا ہے، اور قوت حافظ پیدا کرنا ہو تو رطوبت مناسبہ پید افرما دیتا ہے، اسی طرح تمام اعضاء میں رطوبت مناسبہ پیدا ہوتی ہے، اس کے بعد بحسب وجود شرائط فعل پیدا ہوتا ہے، مگر چونکہ اس کی عادت ہوگئی ہے اس لئے آدمی اسی وجدان طراوت کو قدرت سمجھتا ہے، حالانکہ فعل کی تکمیل جس میں قدرت موثر سمجھی جاتی ہے صرف رطوبت اعضاء سے نہیں ہوتی بلکہ اس میں کشش اعصاب وعضلات کو بھی دخلِ تام ہے، اور اس کا حال ابھی معلوم ہوا کہ نفس اس میں لایعلم محض ہے۔

بادی الرائے میں جو وجدان قدرت معلوم ہوتا ہے وہ قدرت کا وجدان نہیں بلکہ اس کا اشتباہ ہے کیونکہ وجدان کے سمجھنے میں اکثر غلطی ہوتی ہے جس کی کئی نظیریں ہیں ۔

ا۔ جھولا جھولنے اور چکر گھومنے کے بعد وجدان ہوتا ہے کہ تمام چیزیں گھوم رہی ہیں حالانکہ وہ وجدان غلط ہے۔

۲۔ ریل کے بازو سے دوسری ریل گزرے تو اس ریل پر سوار مسافرین کو وجدان ہوتا ہے کہ ہم ساکن ہیں اور دوسری ریل متحرک ہے۔

۳۔ بہت سے لوگ اپنے میں قدرت پا کر بصرف زر کثیر نکاح کرتے ہیں پھر مقصود میں کامیاب نہیں ہوتے حالانکہ قوت کافیہ کا وجدان جو تھا غلط ثابت ہوا۔

۴۔ افیمی کو افیم نہ ملنے کے سبب جو ردی حالت ہو جاتی ہے اس وقت کوئی چیز مشابہ افیون کے دی جائے گو اس میں نشہ نہ ہو تب بھی وہ افیون کا نشہ اپنے میں

پاتا ہے، حالانکہ یہ وجدان بھی غلط ہے، اس لئے کہ وہ چیز نشہ آور نہ تھی۔

جب وجدان میں غلطی ہونا مسلم ہے تو بالفرض اگر ہم قوت کو وجدانی مان بھی لیں تو ضروری نہیں کہ منشاء اس کا واقعی ہو، بلکہ جائز ہے کہ جس چیز کا وجدان ہو رہا ہے وہی یعنی قوت ہی سرے سے معدوم ہو جیسے افیونی کی مثال مذکورہ سے ظاہر ہے، الحاصل وجدانِ قدرت سے قدرت کا وجود اور فعل کا اختیاری ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔

اب یہاں یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ جب دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے ثابت ہے کہ بندے کی قدرت واختیار کو اس کے فعل میں کوئی دخل نہیں تو کسب کے کیا معنی ہوں گے جو لَهَا مَا كَسَبَتْ میں ارشاد ہے؟ اور جزا وسزا کس چیز پر مبنی ہے؟!

اصل کسب کے معنی جمع کے ہیں، اور اس کا استعمال طلب مال ورزق وغیرہ میں ہوا کرتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں ''کسبت المال والرزق'' مطلب یہ ہوا کہ کسی موجود چیز کو حاصل اور جمع کرنے کا نام ''کسب'' ہے، اس صورت میں افعال کا کسب ایسا ہوگا جیسے مال کا کسب، یعنی جیسے مال کے وجود ذاتی میں ہم کو کچھ دخل نہیں ویسے ہی افعال کے وجود میں بھی ہمیں کچھ دخل نہیں بلکہ ان کو صرف اپنے میں جمع کر لینے کا نام کسب ہے جیسا کہ مال کے جمع کرنے میں ہوتا ہے، ہاں فرق اتنا ہے کہ مال کے حاصل کرنے میں مال پہلے سے موجود ہوتا ہے، اور افعال کا وجودان کے کرنے کے وقت ہی ہوتا ہے، اور بندہ ان افعال کا ظرف ہوتا ہے اگر چہ اس اعتبار سے بندہ کو افعال قبیحہ کے ارتکاب پر معذور سمجھا جانا چاہئے! مگر جس طرح ظرف جب محلِ نجاست ہوجاتا ہے تو

اس قابل نہیں رہ سکتا کہ اس کو دسترخوان پر جگہ ملے بلکہ اس کی جگہ مزبلہ یا پائخانہ ہوتی ہے جہاں نجاست کا مقام ہے، گوظرف کے فعل کو وجود نجاست میں کوئی دخل نہیں، اسی طرح بندے کو وجود معاصی میں دخل نہیں، لیکن جب محل نجاست معیوب بن جائے تو قابل تقرب نہیں رہتا، جب تک کہ گناہوں سے پاک وصاف نہ ہوجائے، اگر چہ یہ دونوں ظرف ہیں لیکن بہت بڑا فرق یہ ہے کہ آدمی ایسا ظرف ہے کہ اس کو سمجھ بھی ہے اور سمجھ ایسی چیز ہے کہ مدح وذم کا مدار اسی پر ہے، اسی وجہ سے لڑکے اور سکران اور دیوانے کے افعال قابل مواخذہ نہیں سمجھے جاسکتے، قاتل شرعاً بھی قابل مواخذہ ہے باوجودیکہ نص قطعی سے ثابت ہے کہ مقتول کی عمر میں قاتل کے فعل سے کچھ کمی نہیں ہوتی ،مگر چونکہ اس کی دانست اورزعم میں مارڈالنا ہوتا ہے اس لئے وہ قابل مواخذہ ٹھہرا۔

اگر کوئی شخص اشتباہ کے وقت تحری کرکے نماز پڑھ لے تو نماز اس کی صحیح ہوجائے گی گواس نے خلاف جانب قبلہ نماز پڑھی ہو، کیونکہ اس کی دانست میں قبلہ وہی ہے، قانون سرکاری باب مستثنیات عامہ میں مصرح ہے کہ نیک نیتی سے کوئی فعل ضرر رساں صادر ہوتو جرم نہیں ، کیونکہ اس کی دانست میں ضرر پہو نچانا مقصود نہیں، بہت کم بیمار مرتے ہوں گے جوکسی طبیب کے زیر علاج نہ ہوں یا علاج میں بدعنوانی نہ ہوتی ہو ،مگر چونکہ اس کی دانست یا ارادہ میں ضرر رسانی نہیں ہوتی اس لئے ورثہ بھی اس کو قابل مواخذہ نہیں سمجھتے۔

الغرض صدہا مثالیں مل سکتی ہیں کہ دانست گوخلاف واقعہ ہومگر مواخذہ اسی سے

متعلق ہے، اور جو کام آدمی سمجھ کر کرتا ہے اس کے آثار اس کی طبیعت میں موجود ہوتے ہیں مثلاً کسی دوست کو دشمن سمجھ کر مار ڈالے تو مارنے کے وقت جو کیفیت دشمن پر غالب ہونے کے وقت ہوتی ہے یعنی تعلّی وغیرہ وہ سب اپنے میں پائے گا اور اس پر افتخار کرے گا، پھر جب ظاہر ہو جائے کہ وہ دوست تھا تو اس فعل پر ندامت ہوگی، یہ دونوں آثار صرف اس دانست وعلم سے متعلق ہیں جو دونوں وقت اس میں پائے گئے، اب دیکھئے کہ ہر آدمی کی دانست میں یہ بات کس قدر راسخ اور مستحکم ہے کہ جو کچھ کرتے ہیں ہم اپنے اختیار سے کرتے ہیں اور کسی کام کے وقت یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ فعل حق تعالی ہم میں پیدا کر رہا ہے، گو یہ دانست خلاف واقعہ ہو مگر ثواب وعقاب اسی سے متعلق ہیں، پھر اگر کوئی اس پر ایمان بھی لا یا تو خود اس کی حالتِ قلبی اس کی تکذیب کرتی ہے، الا ماشاء اللہ بہت کم لوگ ایسے نکلیں گے کہ کوئی شخص ان پر تعدی کرے اور ان کی حالت قلبی نہ بدلے، حالانکہ مقتضی اس ایمان کا یہ تھا کہ جو کچھ ایذاء کسی سے پہونچے وہ حق تعالی ہی کی طرف سے سمجھی جائے اور تعدی کرنے والے کا خیال بھی نہ ہو۔

اگر چہ عقلاً ونقلاً یہ مسئلہ مدلل ہے کہ کل افعال مخلوقِ الٰہی ہیں، مگر لڑکپن سے جو عادت ہوگئی ہے کہ ارادے کے ساتھ فعل موجود ہوتا ہے تو اس عادت کی وجہ سے جو بجائے خود طبیعت بن جاتی ہے وجدان گواہی دیتا ہے کہ ہم میں قدرت ہے اور اعتقاد مغلوب ہو جاتا ہے جیسے قوت واہمہ سے عقل مغلوب ہو جاتی ہے مثلاً بلندی پر کم عرض جگہ میں چلنا مشکل ہوتا ہے حالانکہ تجربہ ومشاہدہ اور عقل گواہی دیتے ہیں کہ اس

سے کم عرض جگہ میں آدمی ہمیشہ چلتا ہے۔

پھر جب فعل کے وقت وجدان قوت ایمان پر غالب ہوجائے تو اس حالت میں ایمان سابق کا وجود کالعدم ہے جس طرح قوت واہمہ کے وقت عقل و تجربہ کا وجود بیکار ہے، اس دانست و وجدان کے اعتبار سے مواخذہ خلاف عدل وانصاف ثابت نہیں ہوسکتا، جس طرح قتل شرعاً قابل مواخذہ ہے اور عرفاً وقانوناً دشنام دہی جرم ہے، حالانکہ جس فعل جس فعل کی وہ تصریح کرتا ہے نہ اس کا وقوع زمانۂ ماضی میں ہوتا ہے نہ استقبال میں بلکہ صرف اس کے اس خیال قبیح پر قابل مواخذہ سمجھا جاتا ہے اگر کہا جائے کہ دشنام دہی خود فعل ہے جس کا وجود جوارح یعنی زبان سے متعلق ہے یہ جرم فعل کا ہوگا نہ کہ خیال کا !! تو جواب اس کا یہ ہے کہ اگر قابل مواخذہ ہے تو وہ فعل ہے جس پر الفاظ دلالت کرتے ہیں اور الفاظ اخبار ہوں یا انشاء کسی طرح قابل مواخذہ نہیں ہیں جب تک کہ وہ کسی خیال سے ظاہر نہ ہوئے ہوں اسی وجہ سے اگر کسی خاص شخص کے نام سے گالی دیوار پر لکھی ہو تو اس کا لکھنے والا مجرم اور قابل مواخذہ ہوگا، پھر اگر ثابت ہوجائے کہ گالی دینے والا نشہ کی حالت میں تھا تو معذور سمجھا جاتا ہے حالانکہ زبان کا فعل وہاں بھی موجود ہے مگر چونکہ وہ بے خودی اس کی تسلیم کی جاتی ہے اس لئے اس فعل کو غالباً قابل مواخذہ نہیں سمجھا جاتا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرفاً وعقلاً بھی قابل مواخذہ دانست ہی ہے گو خلاف واقعہ ہو۔

برقی روشنی

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ وحبیبہ

سیدنا محمد واٰلہ واصحابہ اجمعین

ہم جن چیزوں کو روزمرہ دیکھ رہے ہیں اگر غور اور تدبر کی نگاہ سے دیکھیں تو بہت سارے لاینحل عقدے حل ہوسکتے ہیں دیکھئے ہم آج کل مشاہدہ کررہے ہیں کہ یورپ کے عقلمندوں نے برقی روشنی ایک عجیب چیز ایجاد کی ہے جس کے کرشمے ایک عالم کو حیران کررہے ہیں کیا یہ بات عالم کو محو حیرت کرنے کے لئے کافی نہیں کہ صدہا اور ہزارہا چراغ ایک ادنی حرکت سے روشن ہوجاتے ہیں اور پھر ایسی صنعت سے کہ کوئی سفید ہے کوئی سبز اور کہیں سرخ ہے تو کہیں زرد بیسیوں رنگ کے چراغ آن واحد میں جلوہ گر ہوجاتے اور ہر ایک چراغ دوسرے سے کامل ممتاز نظر آرہا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ کہیں پھول کی شکل ہے تو کہیں پتے وغیرہ کی، کہیں چاند کی، کہیں ستاروں کی ! ایسی صنعت میں جدت طرازیوں کو دیکھتے ہوئے کیا بعید ہے کہ آئندہ حیوانات اور انسانوں کی شکلیں بھی بنائی جائیں اور وہ سب ممتاز حیثیت میں نور کے پتلے بن کر اپنے دیکھنے والوں کو محو تماشا بنادیں۔

اس برقی روشنی کا ایک خاص منبع ہوتا ہے جس پر اس عالم نورانی کا دارومدار ہے وہاں ایک ایسا بٹن بنا ہوتا ہے جس کو ایک ذرہ سی حرکت دینے سے یتر ہ وتار مقامات بقعۂ

نور بن جاتے ہیں اور ایسا دلچسپ سماں نظر آتا ہے کہ دیکھنے والے اس کی دلچسپی میں محو حیرت ہو جاتے ہیں۔

اگر پہلے پہل کسی دیہاتی شخص کے روبرو جس نے کبھی اپنی عمر میں برقی روشنی نہیں دیکھی ہو یہ سماں دکھلایا جائے تو جس قدر اس کو حیرانی ہوگی اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا! پھر اگر یہی کام ہر روز اس کے روبرو کیا جائے اور وہ ان روشنیوں کا عادی ہو جائے تو اس کی ابتدائی کیفیت باقی نہیں رہے گی، اور اب اگر اس سے پوچھا جائے کہ بھائی یہ عمدہ عمدہ صنعتیں جو تم ہر روز دیکھ رہے ہو ان کی کیا حقیقت ہے؟ اور ان کا بنانے والا کس درجہ کا صناع ہے؟ تو بے ساختہ اس کے منہ سے یہی نکلے گا کہ ہماری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آتی اور نہ ہمیں اس کے سمجھنے کی کوئی ضرورت ہے یہ تو ایک عامی اور سادہ لوح شخص کی حالت تھی، اگر کوئی عقلمند شخص ہو تو وہ اسی فکر میں لگا رہے گا کہ آخر اس کی لِم کیا ہے؟ اور دفعتاً اس قدر چراغ کیونکر روشن ہو جاتے ہیں؟ بالآخر ایسے لوگوں کو جدوجہد کا ثمرہ مل ہی جاتا ہے اور وہ اپنے حوصلے کے موافق کچھ نہ کچھ سمجھ بھی لیتے ہیں۔

اب عقلمندوں کو اسی پر قیاس کرنا چاہئے کہ عالم پہلے تیرہ و تار تھا بلکہ یوں کہئے کہ عالم کچھ بھی نہ تھا صرف ہر طرف عدم کی تاریکی ہی تاریکی تھی، پھر حق تعالی نے ایک ادنی حرکت ''کن'' سے تمام عالم کو روشنیِ وجود سے منور کر دیا، گویا اس تاریکی میں قسم قسم کے چراغ روشن ہو گئے، کیونکہ موجود بھی ایک چراغ ہے جس سے نور وجود ظاہر ہو رہا ہے ،اور چراغ جس طرح اس تاریکی میں ممتاز ہو کر نظر آتا ہے اسی طرح ہر موجود ممتاز ہو کر

نظر آرہا ہے۔

ادنی تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ چراغ میں بھی نور وجود نہ ہوتو بالکل نظر نہ آئے گا، اس لئے کہ وہی چراغ جب تک عدم میں تھا نمایاں نہ تھا، صرف وجود کی وجہ سے نمایاں ہوگیا، اور قبل وجود اسکا کہیں پتہ نہ تھا، البتہ روشن کرنے والے کے علم میں اس قدر ضرور تھا کہ اس مقام میں فلاں قسم کا چراغ ہو اور اس مقام میں فلاں قسم کا، اسی طرح حق تعالی کے علم میں ہر چیز کا وجود تھا، اس وجود علمی کا سوا ان چراغوں میں یہ بات بھی ضرور تھی کہ منور کرنے والے نے ہر ایک چراغ کو ایک ایک مقام میں معین کر دیا تھا کہ فلاں مقام میں فلاں قسم کا چراغ ہو! اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر ایک چراغ کے لئے ایک ذات تھی جس کا وجود بمجر د روشنی کے خارج میں آ گیا، پس اس ذات معدومہ کو اس چراغ کی عین ثابتہ کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ہنوز اس کا وجود نہیں ہوا بلکہ صرف اس کو ایک قسم کا ثبوت ہے جو وجود کے پہلے کا درجہ ہے، اسی طرح موجودات عالم کے اعیان ثابتہ پہلے سے تھیں جو نور وجود کے ساتھ ہی باہم ممتاز ہوکر وجود میں آ گئیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ آدمی کسی چیز کو موجود نہیں کرسکتا یعنی کسی معدوم کو وجود میں لانے پر ہرگز قادر نہیں ہے، صرف اتنا ہی کرسکتا ہے کہ موجود اشیاء میں ایک خاص قسم کی ترکیب دے کر ایک چیز بنا دیتا ہے، مثلاً مٹی، پتھر، لکڑی وغیرہ کو ایک خاص قسم کی ترکیب دے کر گھر بنا لیا، اگر پیشتر سے گھر کے اجزا موجود نہ ہوتے تو انسان ہرگز گھر نہ بنا سکتا ، اسی طرح برق جو ایک موجود چیز ہے اس میں تصرف کر کے روشن کر دیتا ہے، مطلب یہ

ہے کہ وہ نہ تو برق کی ذات کو وجود میں لاسکتا ہے اور نہ روشنی کو، بلکہ صرف اپنی تدبیر سے موجودہ برقی قوت کو یا یوں کہئے کہ مادۂ برقی کو جمع کر دیتا ہے اور ایک ایسی خاص قسم کی حرکت دیتا ہے جس سے اس میں اشتعال پیدا ہو جاتا ہے اور یہ مادۂ برق یا اصلی قوت جس میں انسان نے تصرف کر کے مشتعل کر دیا ہے حق تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے، اس کی ایجاد انسان کی قدرت سے بالکل خارج ہے۔

اسی طرح انسان کا ہر ایک عمل صرف تصرف اور اشتعال ہے، اشیائے موجودہ میں آدمی جن اعیان ثابتہ کو موجود کرتا ہے وہ موجودات کی ایک خاص قسم کی حالت ہوتی ہے مثلاً مکان کی عین ثابتہ لکڑی، پتھر وغیرہ کی ایک خاص ہیئت تھی جس کا نقشہ بنانے والے نے اپنے ذہن میں ٹھہرایا تھا، پھر ان موجودہ اشیاء میں تصرف کر کے اور ایک قسم کی ترکیب دے کر مکان کی عین ثابتہ کو موجود کر دیا، اگرچہ مکان کا یہ وجود خارجی پہلے نہ تھا مگر وہ اشیاء جن کو یہ ہیئت عارض ہوئی ہے پہلے سے موجود تھیں، بخلاف خداوند تعالیٰ کے کہ ان اعیان ثابتہ کو وجود دیتا ہے جن کا کوئی مادہ خارج میں نہیں ہوتا، ایسا وجود دنیا خاص حق تعالیٰ ہی کا کام ہے اگر خداوند تعالیٰ کی تخلیق کے لئے بھی پیشتر مادہ کی ضرورت ہو تو وہ بھی مثل انسان کے محتاج مادہ ہو جائے گا کہ جب تک مادہ نہ ہو کچھ پیدا ہی نہ کر سکے! حالانکہ خدائے تعالیٰ کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ کسی چیز کا محتاج ہو۔

اور اگر مادۂ عالم پہلے ہی سے موجود ہو اور کسی کا بنایا ہوا نہ ہو تو اس کو ہی خدا کہنا پڑے گا، کیونکہ خدا کے معنی ہی یہ ہیں کہ خود بخود موجود ہو گیا ہو کسی نے اس کو پیدا نہ کیا ہو

جیسا کہ ’’خدا‘‘ کی لفظی ترکیب بھی یہی بتارہی ہے کہ خدا کی اصل ’’خودآ‘‘ تھی اب اگر یہ مان لیا جائے کہ مادہ قدیم ہے اور وہی خدا ہے تو پھر ذات باری تعالیٰ کے ماننے کی ضرورت ہی نہ رہے گی کیونکہ عالم کے لئے ایک خدا کافی ہے۔

چنانچہ مادہ پرست دہرے یہی کہتے ہیں کہ تخلیق عالم کے لئے مادہ کافی ہے خدا کی کوئی ضرورت نہیں، یہ خیال ان کو اس لئے پیدا ہوا کہ ہم جس چیز کو بناتے ہیں اس کا کچھ نہ کچھ مادہ ضرور ہوتا ہے، ایک ہانڈی بنائی جاتی ہے تو اس کے لئے پیشتر سے مٹی کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک صندوق بنایا جائے تو پہلے لکڑی کی ضرورت ہوتی ہے، غرض ہماری مصنوعات میں کوئی چیز ایسی نہیں مل سکتی جس کا کچھ نہ کچھ مادہ موجود ہو، جب ہمیں کچھ بنانے کی ضرورت ہوتی تو پہلے مادہ کو فراہم کرنے کا خیال ہوتا ہے اس سے انہوں نے یہ خیال گڑھ لیا کہ جو چیز پیدا ہوگی اس کا کچھ نہ کچھ مادہ ضرور ہوگا! مگر افسوس انہیں یہ نہ سوجھا کہ آخر مادہ بھی ایک چیز ہے اس کا کیا مادہ ہوگا؟ اگر اس خیال کو وہ مستحکم کرتے اور خوب غور کرتے تو ضرور ان کو ماننا پڑتا کہ ہر چیز کو مادہ کی ضرورت نہیں ہے صرف مادیات محتاج مادہ ہیں۔

بہرحال اپنی مصنوعات پر قیاس کر کے یہ حکم لگادینا کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو بغیر مادہ کے بنی ہو اس لئے عالم کا ایک مادۂ اولی ہونا ضروری ہے ایک بے اصل حکم اور قیاس مع الفارق ہے، اگر آپ ان سے یہ پوچھیں کہ وہ مادہ کیا چیز ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ تو نہ اس کی حقیقت بتلا سکتے ہیں نہ کوئی چیز دکھلا سکتے ہیں، بجز اس کے کہ ایک فرض

کردہ خیالی چیز کی تعریف کر دیں اور کچھ نہیں کہہ سکتے، چنانچہ کوئی کہتا ہے کہ وہ ایک جوہر بسیط ہے جو اپنے ظہور میں صورت کا محتاج ہے اور کسی کا قول ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے سخت اجزاء ہیں جو ٹوٹتے پھوٹتے نہیں۔

اب یہاں غور کرنا چاہئے کہ ابتدائی تقریر ایسی چیز سے شروع ہوئی تھی جو محسوس ہے مثلاً ہانڈی کے لئے مٹی اور صندوق کے لئے لکڑی، اور انتہا اس چیز پر ہوئی جو کسی طرح محسوس ہی نہیں ہوسکتی اور خود مادیین اس کے محسوس کروانے سے عاجز ہیں اور پھر باہم ان میں اس کے متعلق ایسی نزاع واقع ہوئی ہے کہ کوئی فرقہ اپنے دعوی کو ثابت نہ کرسکا جس سے دوسرا فرقہ ساکت ہوجائے، باوجود اس کے ہمارے بعض احباب ان کے اقوال کی ایسی تصدیق کرتے ہیں کہ گویا ایمان لاتے ہیں اور ان خیالی باتوں کے مقابلہ میں خدا ورسول کے فرمانِ واجب الاذعان کو کہ حق تعالی جس چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے اس کو "کن" سے مخاطب کرتا ہے اور وہ چیز فوراً بلا تاخیر وجود میں آجاتی ہے، ہرگز پرواہ نہیں کرتے! اور ان مادیین کی تقلید سے ایک ایسی چیز کے قائل ہورہے ہیں جس کو نہ دیکھا ہے اور نہ دکھلا سکتے ہیں، جب مسلمان کہلاتے ہیں تو کم از کم اتنا تو ہوتا کہ مادیین کی ان باتوں کو جن کا ثبوت خود ان کے نزدیک نہیں ہے نہ مانتے اور خدا کی بات کو جس کے صادق القول ہونے پر بوجہ مسلمان کہلانے کے ایمان رکھنا چاہئے مان لیتے! مگر افسوس ہے کہ اللہ تعالی کی ان کے نزدیک اتنی بھی وقعت نہیں ہے کہ اس کی بات کو ان بے اصل مخدوش اور خیالی باتوں پر ترجیح دیں!!!

نیچریہ یعنی فرقہ دہریہ پر مسئلہ مادہ کا اس قدر اثر ہوا کہ اس مسئلہ کی ابتداء جہاں سے ہوئی تھی اس کو وہ سرے سے بھول ہی گئے، اس لئے کہ ابتداء تو یوں ہوئی تھی کہ اگر ہم کسی چیز کو بنانا چاہتے ہیں تو پہلے مادہ کی ہمیں ضرورت پڑتی ہے، جب مادہ مل جاتا ہے تو اپنی فکر و تدبر سے اس میں تصرف کر کے ایک نئی چیز بنا لیتے ہیں جو پہلے نہ تھی، یہاں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مادہ نہ اپنی ذات سے کوئی کام کر سکتا ہے نہ اس کو عقل و شعور ہے، باوجود اس کے انہوں نے یہ مان لیا کہ بنانے والے کی کوئی ضرورت نہیں صرف مادہ ہی سب کچھ کر لیتا ہے، مادہ جمع ہو کر زمین بن گئی، پانی بن گیا، ہوا ہو گئی، آگ بن گئی، جمادات حیوانات اور تمام کائنات خود بخود بن گئی، اور ہزاروں سینکڑوں چیزیں بنتی جاتی ہیں، اگر اہل اسلام قرآن و حدیث کی کوئی بات ان سے کہتے ہیں جو ان کی معمولی عقلوں میں نہیں آتی تو فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم جب تک مشاہدہ نہ کر لیں گے ایسی باتوں پر ایمان نہ لائیں گے، اب ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ اس عالم کی روزمرہ کی وہ چیزیں جن کو ہم استعمال کرتے ہیں اور اپنی قوت صنعت و حرفت سے نئی نئی وضع کی تیار کرتے ہیں آیا خود بخود بن جاتی ہیں؟ اور کوئی مصنوع ایسا بھی ممکن ہے جو بغیر کسی کے بنائے بن گیا ہو؟ ایسا تو ہرگز ہو نہیں سکتا۔

جب ادنی ادنی چیزوں کا یہ حال ہے تو کائنات کی بڑی بڑی مخلوقات کیونکر خود بخود بن گئی ہوں گی؟ مشاہدہ کے خلاف ان کی عقلوں نے کس طرح تسلیم کر لیا کہ تمام عالم خود بخود بغیر کسی خالق علیم و حکیم کے بن گیا ہے؟ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے

دیہاتی بیوقوف نے برقی روشنی کے ہزار ہا چراغوں کوخود بخود روشن ہوتے دیکھا اور روشن کرنے والا اس کو نظر نہ آیا تو اس کے سادہ ذہن نے یہ نتیجہ نکالا کہ جب رات ہوتی ہے تو یہ سب چراغ خود بخود روشن ہوجاتے ہیں! اب اس سے ہزار کہئے کہ بھائی یہ برقی روشنی ہے تم برق کی قوتوں اور کرشموں سے ناواقف ہو یہ سب چراغ برقی قوت سے روشن ہوتے ہیں اور ایک شخص ان کو روشن کرنے والا ہوتا ہے جو ایک خفیف سی حرکت سے سب کو آن واحد میں روشن کردیتا ہے، مگر اس سادہ لوح کے ذہن میں یہ بات نہ آئے گی اور وہ ہرگز باور نہ کرے گا بلکہ یہی کہے جائے گا کہ: اگر یہ بجلی ہے تو اس کی گرج کہاں ہے ؟ ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ بجلی چمکے اور اس کی گرج نہ ہو! اگر دوری کی وجہ سے اس کی آواز نہ سنی جائے تو یہ بات اور ہے مگر جہاں چمکتی ہے وہاں تو آواز ضرور ہوتی ہے، پھر اگر یہ بجلی ہے تو اس کی روشنی پورے تار میں کیوں نہیں ہوتی اور وہ تار گرم کیوں نہیں ہوتا؟ اور چراغ کی طرح وہ بھی روشن کیوں نہیں نظر آتا؟ اور جن لکڑیوں سے وہ متعلق ہے وہ کیوں نہیں جل جاتیں؟ کیا اس احمق کی یہ دلائل عقلمندوں کے نزدیک قابل التفات ہوسکتی ہیں!! ہرگز نہیں، عقل والے یہی سمجھیں گے کہ وہ بے وقوف معذور ہے، اس کی کمزور عقل اس قابل نہیں کہ مسئلہ برق کو سمجھ سکے، مگر عقلاء فوراً مان جائیں گے اور بحسب مدارج عقل برق کی طاقتوں اور کرشموں کے قائل ہوجائیں گے اور کم ازکم اتنا تو ضرور کہیں گے کہ: گو ہمیں اس کی حقیقت معلوم نہ ہو اور کس قسم کی حرکت سے وہ روشنی ہوتی ہے اور اس حرکت میں اور روشنی میں کیا مناسبت ہے گو ہم نہ سمجھ سکتے ہوں، مگر ہم یہ ضرور

کہیں گے کہ کوئی شخص ضرور ہے جو ایک خاص قسم کی صنعت اور حرکت سے ان تمام چراغوں کو روشن کیا کرتا ہے، یعنی محرک اور منور کے وجود کے وہ ضرور قائل ہو جائیں گے ۔

اہل ایمان بھی سمجھتے ہیں کہ جس طرح اس جنگلی کی سمجھ قاصر ہے اور سمجھ نہیں سکتا کہ صرف ایک حرکت سے ہزاروں چراغ کیونکر روشن ہو جاتے ہیں؟ اسی طرح ہماری سمجھ اس بات سے قاصر ہے کہ خداوند تعالی ایک لفظ ''کن'' سے تمام مخلوقات کو کیونکر پیدا کر دیتا ہے، اور جس طرح عقلاء تسلیم کر لیتے ہیں کہ ایک ادنی حرکت سے ہزاروں چراغوں کا آن واحد میں روشن ہو جاتا کوئی خلاف عقل بات نہیں، اسی طرح وہ عقلاء جن کو دین کی عقل ہے اور ہمیشہ قرآن وحدیث کے مضامین میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں ان کو صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ بیشک جس چیز کو حق تعالی پیدا کرنا چاہتا ہے ایک امر ''کن'' سے پیدا کر دیتا ہے، یعنی اس کو ارشاد ہوتا ہے کہ ''ہو جا'' وہ فوراً ہو جاتی ہے، ان کو اس بات کا عقل سے بھی یقین حاصل ہوتا ہے کہ جس طرح خداوند تعالی کا وجود کسی کا محتاج نہیں خود بخود اس کا وجود ہے، اسی طرح وہ اپنے افعال میں بھی کسی کا محتاج نہیں ہے، اس کو نہ مادہ کی ضرورت ہے نہ آلات واوزار سے مدد لینے کی، اگر ایسا نہ ہو تو پھر بندہ اور خالق میں فرق ہی کیا ہوا؟ بندہ بھی بغیر مادہ کے کوئی چیز بنا نہیں سکتا اور خالق بھی بغیر مادہ کے نہ بنا سکا، خالق کے افعال کو بندوں کے افعال پر قیاس کرنا خالق کی بے قدری کرنی ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ۔

اگر برقی روشنی میں کامل طور پر فکر کی جائے تو بہت سے دینی مسائل کا کامل ثبوت مل سکتا ہے، بشرطیکہ ایمانی نظر سے دیکھیں۔

اگر حق تعالیٰ توفیق دے تو کسی مقام میں اس سے متعلق اور بھی کچھ لکھا جائے گا ، حق تعالیٰ ہمیں ایمانی نظر عطاء فرمائے تا کہ ہر چیز سے فائدۂ اخروی اور دنیوی حاصل کرسکیں۔

نسأل الله التوفيق